مزدك Vol-1

مزدک

مزدک

شاہ محمد مری

شاہ محمد مری

سنگت اکیڈمی آف سائنسز

کتاب کا نام : مزدک

مصنف : شاہ محمد مری

پہلی اشاعت : 2015

دوسری اشاعت : 2018

قیمت :

سنگت اکیڈمی آف سائنسز

انتساب

سید سبطِ حسن کے نام

جس نے ہمارے پورے خطے کو خرد اور شعور سے مالا مال کیے رکھا۔

کندیل بلوچی کتابجا

WWW.QANDEEL.XYZ

مزدك Vol-1

توماسو کمپنیلا

جین ملیئر

جیرارڈ ونسٹن لے

تھامس مور

سینٹ سائمن

ایڈوارڈ ویلنٹ

چارلس فیوریئر

جین جاریز

پرودھون

باکونن

نکولائی چرنی شیوسکی

پیاترلاوروف

نکولائی میخائلوفسکی

والٹیئر

قرۃ العین طاہرہ

پیش لفظ

جس طرح شر، بدی اور ابلیسیت کی جڑیں بہت گہری ہیں۔جس طرح یہ ایک پورا قبیلہ ہے جس کا شجرۂ نسب بہت طویل ہے۔ یہ نہ صرف اپنے آباؤاجداد سے پہچانی جاتی ہے، بلکہ انہی کے تذکرے اور تجربات سے تقویت پاتی ہے۔بعین ہی خیر کا معاملہ ہے۔نیکی اور خیر بغیر جڑوں کے کبھی نہیں رہے۔خیر کے شجر کا اپنا شجرہ ہے۔خیر کا پرچم، نعرہ اور بینر ''انسانوں سے بھلائی'' کا رہا ہے۔خیر کو مگر دشواریاں بہت کٹھن درپیش ہیں۔اس کا ویری اگر سماجی معاملات پہ شیطان رہا ہے تو سیاسی معاملات میں اس کا بدخواہ طبقاتی نظام رہا ہے۔اسے صحت کے شعبے میں چیچک وطاعون وایڈز کے خلاف جدوجہد کرنا پڑتی ہے، تو سماجی میدان میں بے علمی اور بے اتفاقی کے خلاف لڑائی لڑنا پڑتی ہے۔اسے راست وراستبازی کے حق میں حرکت وتحریک رواں رکھنی ہوتی ہے' اور کائنات میں موجود دیگر مخلوقات کے ساتھ انسان کی ہلکی سی طرفداری میں پرامن بقائے باہم کے ساتھ زندگی گزارنے کی شعوری کوشش کرنی ہوتی ہے، اور فطرت کے ساتھ بھرپور دوستی سے مسرت کشید کرنا ہوتا ہے............

یہ ایک بہت ہی وسیع ایجنڈا ہے۔

چنانچہ، خیر کبھی محدود مینی فیسٹو لے کر نہیں چلتی۔ یہ محض ایک قوم، ایک مخلوق کی ترجمانی نہیں کرتی، بلکہ یہ دو پاؤں کی وجہ سے بے مثال امور نمٹا سکنے والی انگلیوں کے ساتھ دو ہاتھوں کی نعمتوں سے سرفراز انسان کی ہیڈ ماسٹری میں اُن سارے دیگر مظاہر فطرت کو سکھ پہنچاتی ہے جو ناطق نہیں اور فکر وشعور سے بھی محروم ہیں۔ یہ بالخصوص پوری انسانیت کی بہبود کے لیے (اور انسان دشمن دو فیصدی کے خلاف) کام کرتی ہے............خیر نے تاریخ کے طویل دورانیے میں اچھی اچھی چیزوں کو چُنتے رہنے اور اپنی زادِراہ کے بطور اپنی گدڑی میں ڈالتے رہنے کا کام کیا ہے۔

فطرت دوست، خیر انسان دوستی کا دوسرا نام ہے۔ اور وہ بھلا کیسا عاشق ہوگا جسے محبوبہ سے تو عشق ہو مگر پھولوں پھلواریوں آبشاروں، مسکراہٹوں، امن اور خوشحالیوں سے پیار نہ ہو۔

لہٰذا اگر بدی کا تباہی وتخریب کا ایجنڈا بہت وسیع ومتنوع ہے تو خیر کا منشور بھی بہت پھیلا ہوا ہوتا ہے۔ ہر بات کا غم، ہر چیز پہ پریشانی اور ہر کام کا عزم۔۔۔اس جلد میں خیر کے اولین ترجمانوں کا تذکرہ شامل ہے۔

ایک منصفانہ اور خوشحال سماج کے لئے انسان ہمیشہ سے کوششیں کرتا رہا ہے۔کبھی ایسے طریقوں سے کہ آج ہنسی آجائے اور کبھی ایسے طریقوں سے جنہیں باقاعدہ رواج وروایت بنا کر بار بار دوہرایا جاتا رہا ہے۔سماجی انصاف کے لئے یہ ساری انسانی کاوشیں ڈریس ریہرسلیں رہی ہیں۔ حتمی صفتی منزل اُتنی ہی دور ہے جتنا کہ یہ اولین لڑاکا کے وقت تھی۔مگر تعدادی اور چھوٹی چھوٹی اتنی بڑی تبدیلیاں آئیں کہ تاریخی اہمیت کے اعتبار سے بہت ہی اہم حاصلات ہوئیں۔

خیر بھی انسانی سماج کی طرح (اور اس کے ساتھ ساتھ) ارتقا کرتا رہا ہے۔ یہ مدہم و موہوم سے روشن وواضح کی طرح سفر کرتا رہا ہے۔

خیر اپنے حصول ودوام کے لیے انسان سے جدوجہد مانگتی ہے۔جدوجہد اچھی چیز ہے۔ غلطیاں اچھی چیزیں ہیں۔ بس جدوجہد ترک نہیں کرنی چاہیے اور غلطیاں دوہرانی نہیں چاہئیں۔ انسان آخر انسان ہے، کبھی دیکھو تو خود رو عوام الناس کے پیچھے پیچھے دوڑتا ہے کبھی دیکھو تو ''بڑا لیڈر'' والی بیماری میں مبتلا ہو کر تباہیاں بکھیرتا رہتا ہے۔

یہ سب ورثہ ہمارا ہے، یہ ساری تاریخ ہماری ہے۔اس سب کو بانہوں میں سما کر مستقبل کا راستہ بنانا ہے۔اس سارے انسانی تجربے کو پھینکا نہیں جا سکتا۔۔۔۔کہ انسان کی جڑیں ہیں۔

بے جڑ ہونا غیر انسانی ہے۔ اپنی جڑیں تلاش نہ کرنا غیر انسانی ہے۔ آیئے اے اچھے انسان! اپنی جڑیں تلاش کریں۔

تلاش شروع کرنے سے پہلے یہ بتانا ضروری ہے کہ شروع کے خیر خواہ انسان وہ تھے جنہیں یوٹو پیائی کہا جاتا ہے۔ یہ وہ لوگ تھے جن کا خیال تھا کہ سماج میں بغیر کسی بنیادی تبدیلی کے، محض اصلاحات کے ذریعے بہتری لائی جاسکتی ہے۔ انہوں نے بے شمار طریقے ایجاد کیے اور انہیں استعمال کیا تاکہ مجبور ومقہور و لاچار انسانوں کے لئے اچھی روشن صبح پیدا ہو۔ جب ہم یوٹو پیائی فلاسفروں کے بارے میں پڑھتے اور سنتے ہیں تو لگتا ہے کہ وہ لوگ کچھ کچھ پاگل تھے extraragant طرز کے cranks۔ ان سب کا زمانہ بہت کنفیوز زمانہ تھا جہاں ابھی تک سادہ تصورات رکھنا ممکن تھا۔ شاہ عنایت سے لے کر سینٹ سائمن تک اور مست توکلی تک ایک rationalistic فلسفہ تھا، جس سے توقع تھی کہ سارے مسائل کو حل کردے گا، مگر ہر جگہ یہ فلسفہ سماج کو despotism اور غربت سے نہ بچاسکا۔ خیال تھا کہ مکینیکل ایجادات انسانیت کی عظیم اکثریت کی زندگی بہتر کریں گی، مگر ان ایجادات نے بہت سارے انسانوں کی زندگیوں کو عذاب بنادیا۔ ان کا سارا فلسفہ دھڑام سے گر گیا۔ ظاہر ہے کہ ناکام رہے اور زندگی کی نفی یعنی موت کے حوالے ہوئے، قتل انجام ہوا، ہیبت ناک جیلیں انت بنیں۔ اعضا کاٹنے کے سزاوار ٹھہرے۔

یہ کتاب اُنہی نیک دل مگر سادہ انسانوں کے تذکرے کے بہی کھاتے کی اولین جلد ہے۔

شاہ محمد مری

6 جولائی 2018

سپارٹیکس

جگہ کا نام ہے: روم۔ یہ اٹلی کا دارالحکومت ہے۔ حضرتِ یسوع مسیح کی پیدائش سے ایک ہزار سال قبل تک اس پہاڑی مگر سرسبز علاقے کی آبادی بہت کم تھی۔ یہاں آریائی قبائل کی شان وشوکت کچھ قصبوں کو معرضِ وجود میں لا چکی تھی۔

اگر میرا قاری بور نہ ہوجائے تو میں ایک دو فقرے پس منظر کو سمجھنے کے لیے یہاں شامل

کردوں۔ اٹلی کے جنوب میں یونانی آباد تھے۔ جبکہ مرکزی حصے میں ایک غیر آریائی آبادی، ایٹرسکانی سکونت پذیر تھے۔ اور انہوں نے مختلف آریائی قبائل کو زیرنگیں کرلیا تھا۔ چھٹی صدی قبل مسیح میں ایٹرسکان بادشاہوں کی ظلِ الٰہیت ختم ہوجاتی ہے اور روم اشرافیہ کا ریپلک بن جاتا ہے۔ پٹر یشیائی خانوادوں پر مشتمل افراد لاٹ صاحبان کا طبقہ بن جاتے ہیں اور پبلیشیائی فرقے کو محکوم بنادیا جاتا ہے۔ یہ محکوم پبلیشیائی لوگ کئی صدیوں تک اپنی آزادی اور حکومت میں حصہ دار بننے کی جدوجہد کرتے رہے اور بالآخر وہ اس میں کامیاب ہوگئے۔

دوسری طرف سکندر کی سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا تھا اور سلطنت اُس کے جرنیلوں میں بٹ گئی تھی۔ اس کے ایک ساتھی پائرس نے تربیت یافتہ فوج جمع کرکے اٹلی پر حملہ کردیا۔ اور 270 ق۔م میں رومنوں کو شکست دی۔ اس نے انہیں شمال کی طرف دھکیل دیا، اور خود سسلی کی طرف پیش قدمی شروع کی۔ مگر سسلی کے نزدیک اُس وقت دُنیا کا عظیم ترین تجارتی شہر کارتھیج واقع تھا۔ جس کی بھرپور مدد سے رومنوں نے پائرس کو شکستِ فاش دے دی۔ یوں روم کی سلطنت وسیع تر ہوگئی اور اب اس کے راستے میں واحد رکاوٹ وہ عظیم تجارتی قوت رہ گئی تھی جس کا نام کارتھیج تھا۔

تقریباً ڈھائی سوسال قبل مسیح میں روم اور کارتھیج کے مابین لڑائیاں شروع ہوئیں جنہیں دُنیا PUNIC WARS کے نام سے جانتی ہے۔ ان طویل جنگوں کا نتیجہ بالآخر رومنوں کے حق میں نکلا اور کارتھیج کو (149 ق۔م) میں شکستِ فاش ہوگئی۔ روم کی طاقت بڑھتی گئی، اس کا زیرِ تسلط علاقہ وسیع تر ہوگیا اور ہزاروں کی تعداد میں کارتھیج باشندے غلامی کی زنجیروں میں جکڑے گئے۔

اب سامی النسل ریاستوں اور شہروں میں صرف جوڈیا کا علاقہ آزاد بچا ہوا تھا۔ جس کے مرکز یروشلم پر رومنوں نے 65 ق۔م میں قبضہ کرلیا۔

390 ق۔م سے لے کر 240 ق۔م تک کا زمانہ وہ تھا جب روم آزاد کاشتکاروں کا ریپلک رہا۔ اس دَور میں بڑی بڑی سڑکیں بنیں اور لوگوں کو روم کی شہریت ملتی گئی۔ اس دَور میں ہر مقبوضہ علاقہ رومن تہذیب میں گھل مل جاتا اور فاتح ومفتوح جُدا نہیں بلکہ ایک وحدت بن جاتے۔

مگر 240 ق۔م کے بعد کا مرحلہ نیا تھا۔ سسلی کو فتح کرکے اُسے رومیوں کا مفتوحہ علاقہ قرار دیا گیا۔ اس کے خزانے اور زرخیز زمینیں رومنوں کے تصرف میں دی گئیں۔ اس جنگ میں بے شمار غلام ہاتھ آئے۔ اس سے قبل رومن ری پبلک کی آبادی زیادہ تر شہریت حاصل کردہ کاشتکاروں پر مشتمل تھی۔ فوجی خدمات کی انجام دہی اُن کی ذمہ داری تھی۔ فوجی خدمات کی انجام دہی کے دوران ان کے کھیت قرض تلے دَب گئے اور وہاں ایک نئی اور وسیع زرعی غلامی اُبھرنے لگی۔ جب وہ فوج سے واپس آئے تو انہوں نے اپنی پیداوار کو سسلی اور خود روم کی نئی جاگیروں میں غلاموں کی کاشت کردہ پیداوار کے ساتھ مقابلے میں پایا۔ ریپلک کی خصوصیت بدل چکی تھی۔ نہ صرف سسلی روم کے قبضے میں تھا بلکہ عام آدمی دولت مند قرض دہندہ کے قبضے میں تھا۔ روم اب امیر لوگوں کا ریپلک بن چکا تھا۔ روم کے کاشت کار سپاہی تمام حقوق سے محروم ہوگئے۔ ان کی انتخابی مراعات بھی چھن گئیں۔ سینٹ ریپلک کا حکمران ادارہ تھا۔ دوسرے نمبر پر وہ لوگ تھے جنہیں طاقتور افسروں نے سینٹ میں بٹھایا۔ دوسرے الفاظ میں سینٹ بڑے بڑے زمینداروں اور بڑے تاجروں کا ایوان تھا۔ یہ ایوان رومی سیاست کا مرکز رہا۔ روم کا عام آدمی کسمپرسی کی حالت میں تھا، اس کی زمین چھن گئی، وہ غلامی کی منافع بخش پیداوار سے بے دخل ہوا اور اس کے پاس کوئی سیاسی قوت نہیں رہ گئی۔ پس اس کے پاس اظہار کا محض ایک ذریعہ رہ گیا تھا۔۔۔۔ بغاوت۔

روم کی دوسری و پہلی صدی قبل مسیح کی داخلی سیاست کی تاریخ ناکام انقلابی بغاوتوں کی تاریخ ہے۔ یہ بغاوتیں اور خانہ جنگیاں جاگیریں ختم کرنے، زمین آزاد کاشت کاروں کو واپس کردینے اور ،قرضوں کی ضبطگی کی خاطر ہوتی رہیں۔

اٹلی کی اس بے آرامی کے وسیع پس منظر میں 73 ق۔م میں سپارٹیکس کی قیادت میں ہونے والی عظیم بغاوت ہوئی۔

سپارٹیکس ایک پیدائشی غلام تھا جسے زبردستی اغواء کرکے اٹلی لے جایا گیا۔ وہاں اُسے قتل کرنے کی تربیت دی گئی تھی۔ وہاں اُس زمانے میں خصوصی اکھاڑے بنائے گئے تھے۔ ان اکھاڑوں میں دو غلاموں کو لڑنے کے لیے چھوڑا جاتا۔ وہ اُس وقت تک آپس میں لڑتے رہتے جب تک کہ دونوں، یا دونوں میں سے ایک قتل نہ ہوتا۔ یہ اکھاڑے فارغ، بیکار، اور بدکردار آقاؤں کی تفریحِ طبع کا سامان

مہیا کرتے تھے۔ایسے لڑاکا کو غلام کو''گلیڈی ایٹر'' کہتے تھے۔

بہت عرصے سے قائم اکھاڑوں میں غلام اپنے آقاؤں، اُن کی محبوباؤں، اور یا اُن کے ہم جنس پرستی کے لونڈوں کی تفریح طبع کے لیے موت تک آپس میں لڑائے جاتے تھے۔اکھاڑہ مالکان کے لیے یہ ایک زبردست کاروبار تھا جو ملک کے کونے کونے میں جاری وساری تھا۔بدکردار حاکم گاہکوں کی طرف سے انہیں بہت پیسہ ملتا تھا۔

سپارٹیکس نامی غلام بھی ایک اکھاڑے میں مرگ کے اس کھیل میں جھونک دیا گیا تھا۔مگر اس کا شعور دھکوں، توہینوں، کراہوں سے پروان چڑھ گیا تھا۔اب وہ انفرادی مقابلوں ہی سے نہیں بلکہ اس سارے نظام کے خلاف تھا۔اس نے اپنے اشرف انسانی رویوں اور کبھی کبھار بولنے سے اپنے ساتھی غلاموں (گلیڈی ایٹروں) میں راہنمایانہ مقام حاصل کیا تھا۔اُس کا شعور دوسروں میں سرایت کرتا رہا۔ایک ایک کر کے انہیں سمجھ آتی گئی۔رفتہ رفتہ کوانٹٹی کوالٹی میں بدل گئی اور پھر،''اچانک'' بغاوت ہوگئی۔

سپارٹیکس 70 سے 80 گلیڈی ایٹروں کو ساتھ ملا کر اکھاڑے کے پہریدار فوجیوں سے لڑا اور انہیں شکست دے کر اُس سکول کے تمام گلیڈی ایٹروں کے ساتھ کاپوآ نامی شہر اُس اکھاڑے سے نکل گیا جو باتیاتس کی ملکیت تھا۔یکدم شہر کاپوآ کی سرکاری چھاؤنی کی فوج اکھاڑے کے دولتمند مالک باتیاتس کی مدد کیلئے آئی، سپارٹیکس اُس فوج کے خلاف بھی لڑا اور اُسے بھی شکست دی۔

اُس نے آقاؤں کی ظالمانہ اور گلی سڑی حکمرانی کے خلاف بغاوت کے شعلے بلند کیئے۔آس پاس شہروں، دیہاتوں اور پہاڑوں سے مایوس غلام مردوں،عورتوں اور بچوں نے باورچی خانوں،اصطبلوں اور کھیت کھلیانوں سے نکل کر رومن ایمپائر کے خلاف عظیم ترین بغاوت میں حصہ لیا
۔

اب یہ جنگ ایک پوری سماجی سیاسی اور معاشی جنگ بن چکی تھی۔غلام داری نظام کے خلاف جنگ، غلام داری نظام کی معاشی سماجی مظالم کے خلاف جنگ۔اور اس بڑے پیمانے کی جنگ کا راہنما سپارٹیکس تھا۔

سپارٹیکس غلاموں کا محض کمانڈر اور قائد ہی نہیں تھا، بلکہ وہ ان کا بہترین دوست اور شفیق باپ بھی ہے۔وہ ایک عاشق بھی ہے اور ایک نظریہ دان بھی۔اس کی بہادری، پہل کاری، فہم وفراست اور قوتِ فیصلہ اُسے راہنما بناتے ہیں۔اسی طرح روشن مستقبل پہ اس کا عمیق اور پختہ یقین، اور اس یقین کو لاکھوں لوگوں کے سینوں میں منتقل کرنا دراصل وہ خوبیاں ہیں جو جنگِ آزادی میں برسرِ پیکار عوام کے ہر راہنما میں ہوتی ہیں۔

غلاموں کی اِس بغاوت کو کچلنے کے لیے دوسری چھاؤنیوں سے دو بڑی سرکاری فوجیں بھیجی گئیں۔مگر غلاموں نے انہیں بھی تباہ و برباد کر دیا۔سلطنتِ رُوم کی چولیں ہلا ڈالنے والی یہ بغاوت 73 ق۔م میں شروع ہوئی تھی۔اور 71 ق۔م تک جاری رہی۔71 قبل مسیح میں ایک اور بڑی فوج کو ناکام کرنے کے بعد یہ انقلاب ناکام ہوا۔(مگر عوامی انقلاب ناکام کہاں ہوتے ہیں۔یہ تو 1917 کیبالشویک انقلابات کا1905 ہوتے ہیں)۔

غلام انقلابیوں کو شکست ہوگئی۔سپارٹیکس کے قریبی ساتھی یا تو لڑائی میں کام آئے یا پھر گرفتار ہو کر چھ ہزار ساتھیوں کے ساتھ شاہراہ کے ساتھ ساتھ کھڑے کیے گئے اونچے صلیبوں پر زندہ، بڑی کیلوں کے ساتھ ٹھونک دیئے گئے اور خون رِس رِس کر کم ہو جانے کے سبب نمیران اور امر (شہید) ہوگئے۔سپارٹیکس کہاں تھا؟ سپارٹیکس خود بھی ایسی ہی ایک صلیب پر لٹکا ہوا تھا۔اور تین دن تک اس کا خون، رس رس کر کم ہوتا گیا اور ہر گھڑی مرتے مرتے وہ بالآخر مارٹر ہو گیا۔

اس کی فکری نظریاتی کامریڈ اور محبوبہ بیوی ورینیا گرفتار ہوئی، وہ اُس کے بیٹے کو جنم دے کر دشمن افواج کے کمانڈر انچیف کے قبضے میں چلی جاتی ہے جسے وہ love slave بنانا چاہتا ہے۔(وہ اپنے بیٹے کا نام سپارٹیکس رکھتی ہے)۔مگر جس عورت نے پاک سپارٹیکس کا پیار پایا ہو وہ کسی اور سے کیا دل لگا پائے گی۔ورینیا کو گراکس نامی ایک دولتمند شخص کرائے کے بدمعاشوں کے ذریعے جرنیل کے گھر سے اغواء کراتا ہے۔مگر وہ ظاہر ہے اُسے بھی ٹھکرا دیتی ہے۔چنانچہ وہ دولتمند گراکس اُسے دور دیس بھجوا دیتا ہے جہاں جرنیل کی پہنچ نہ ہو۔وہ ورینیا کو آزاد کرنے کے سند عطا کرتا ہے اور پھر خود، خودکشی کرتا ہے۔

فلسفی پلوٹارخ نے سپارٹیکس کو نہ صرف عظیم روح اور عظیم جسمانی قوت قرار دیا بلکہ اُس کے بقول ''وہ تو سب سے زیادہ عقلمند اور مہذب'' انسان تھا۔

کارل مارکس نے سپارٹیکس کو اپنا ہیرو قرار دیا اور اسے ''پوری قدیم تاریخ میں سب سے زیادہ شاندار شخص اور عظیم جرنیل قرار دیا، جو کہ کردار میں پاک تھا، قدیم پرولتاریہ کا حقیقی نمائندہ تھا''۔

اس بغاوت کے بارے میں مشہور انقلابی' لینن نے لکھا کہ:''سپارٹیکس اُن عظیم بغاوتوں کے بہت بڑے ہیروؤں میں سے تھا جو غلاموں نے تقریباً دو ہزار سال پہلے برپا کی تھیں۔ رُوم کی بہ ظاہر انتہائی طاقتور سلطنت نے، جس کا دارومدار صریحاً غلامی پر تھا کئی سال تک ان غلاموں کی زبردست بغاوت کی ضربیں اور چوٹیں کھائیں جنہوں نے سپارٹیکس کی قیادت میں مسلح اور متحد ہو کر بڑی فوج بنالی تھی''۔

سپارٹیکس جدید زمانے کے انقلابیوں کے لیے روحانی فیض تھا۔ بالخصوص جرمن کمیونسٹ پارٹی کا پہلا نام ''سپارٹیسسٹ لیگ'' تھا۔ اسی طرح 1970 کی دہائی میں آسٹریا میں فاشسٹ مخالف تنظیم کا نام بھی اُسی پر رکھا گیا تھا۔ ہمارے زمانے کے ہر دلعزیز کمیونسٹ چے گویرا سپارٹیکس کا بہت ہی معترف تھا۔

سپارٹیکس پہ بے شمار کتابیں' مضامین اور ڈرامے لکھے گئے۔ اس پر بے شمار فلمیں بنیں۔

سپارٹیکس کی زندگی اور جدوجہد پر مشہورِ زمانہ ناول ہاورڈ فاسٹ نے لکھا۔ اُس کا کہنا ہے کہ:''سپارٹکس کی زیرِ قیادت غلاموں کی یہ جنگ بہادر مردوں اور عورتوں کی کہانی ہے۔ جو قدیم زمانے میں گزرے اور جن کے نام کبھی بھی فراموش نہ کئے گئے۔ اس کہانی کے ہیروؤں نے انسانی وقار اور آزادی کو عزیز رکھا اور وہ شرافت اور نیکی میں جئے۔ میں نے اُسے اس لئے لکھا تاکہ وہ لوگ جو اُسے پڑھیں گے (میرے بچے اور دوسرے)، وہ اپنے مستقبل کے لئے قوت حاصل کرسکیں اور ظلم اور بدی کے خلاف جدوجہد کریں......تاکہ سپارٹیکس کا خواب ہمارے اپنے دَور میں پُورا ہو جائے''۔

سپارٹیکس محض غلاموں کی (73 ق۔م) جنگِ آزادی کا راہبر و ہیرو نہیں بلکہ وہ تو بلند نظری اور مقدس انسانی آدرشوں کے لئے لڑی جانے والی ہر لڑائی کے راہبر کا نشاں اور علامت ہے۔ ہر عوامی جنگ کا اپنا ایک سپارٹیکس ضرور ہوتا ہے اور خواہ اس کا رنگ، نسل، مذہب، زبان اور قومیت اصل سپارٹیکس سے کتنے ہی مختلف کیوں نہ ہوں، اُس میں خصلتیں سپارٹیکس ہی کی ہوتی ہیں۔ دُنیا کے ہر لُٹے پسے اور مظلوم ومحکوم طبقے اور قوم کی تحریک آزادی میں (قطع نظر قد کاٹھ، وقت ورواج، حسب نسب اور تاریخی ارتقا کے کسی مخصوص دَور کے) ایک لیڈر موجود ہوتا ہے، سپارٹیکس جیسا ایک لیڈر موجود ہوتا ہے۔ بے شک کہ یہ راہنما پہلے سے تراشا اور گھڑا ہوا لیڈر نہیں ہوتا، بلکہ اسی جنگِ آزادی کی صفوں میں سے کوئی شخص آناً فاناً سپاہی سے سپارٹیکس بن جاتا ہے اور پھر وہ نہ صرف اپنے ساتھی انسانوں کو اشارۂ ابرو سے متحرک کرتا ہے بلکہ دریاؤں تک کو رُخ بدلنے کا حکم دیتا ہے................. اور وہ تعمیل حکم کرتے ہیں۔

ان مقبول ومحبوب سپارٹیکسوں کے نزول کا سلسلہ یقیناً اس وقت تک جاری رہے گا جب تک کہ انسانی سماج سے منحوس ترین منحوس چیز، یعنی نجی ملکیت کا خاتمہ نہیں ہوتا۔

اُس کے بعد بھی مائیں سپارٹیکس جننا بند نہیں کردیں گی اور محبوبائیں سپارٹیکسوں کو پیار کرکے انہیں مافوق الفطرت دیوتا بننے سے روکنا بند نہ کردیں گی، گو کہ وہ سپارٹیکس، وہ ماں اور وہ محبوبہ اُس وقت ذرا مختلف ہوں گی۔ اس لئے کہ اب اُن کا مدِ مقابل رومن ایمپائر نہیں وحشتناک طبقاتی نظام نہیں بلکہ ایک اور مہیب سپر پاور' یعنی فطرت ہوگی۔ فطرت، جس کی اندھی قوتوں کے خلاف لڑائی اور اس کے پوشیدہ رازوں کے کھوج کی جدوجہد کی صُورت ہی مختلف ہوتی ہے۔

مزدك Vol-1

مزدک

(شہادت528)

اب تو اچھے خاصے شواہد آ چکے ہیں کہ بلوچوں کا انسان دوست مزدک سے بہت تعلق رہا ہے ۔مزدک ایک سیاسی اور سماجی انقلاب کا بانی تھا جو اسلام سے لگ بھگ ایک ہزار قبل ہمارے ہی خطے اور اس کے آس پاس برپا ہوا تھا۔ ہمارے منطقے میں یہ ایک ایسا نظریہ ابھرا تھا جس میں خوابیدگی، فاقہ کشی ،خود ایذا رسائی اور محض شخصی مثال ہی نہ تھا۔ یہ تو ایک فکری وروحانی ایسی تحریک تھی جسے تشدد کے استعمال پہ ہی انقلاب کہا جا سکا یعنی مزدکیت ایک ایسا سوشلزمی نظریہ تھا جس میں فکر،تحریک، تنظیم اور جدوجہد (پرامن بھی اور متشدد بھی) سب کچھ شامل تھا۔ یہ اپنے نظریہ اور عمل دونوں اعتبار سے بلوچ کے مزاج کی چیز تھی۔اسی لیے اُن میں پاپولر ہوئی۔

مزدک کی زندگانی اور جدوجہد کے بارے میں فردوسی ،طبری ، خیال مروہوی، اور براؤن کی چوکڑی نے میری مدد کی۔اصل منبع فردوسی ہے، جو تاریخ میں کبھی پرائمری سورس بنتا ہے اور کبھی ثانوی۔ خیال امروہوی نے اپنی پی ایچ ڈی کی ڈگری تہران سے لی ۔اور اس کو کتابی صورت میں فارسی زبان میں ''عقائد مزدک'' کے نام سے شائع کیا۔ یہ کتاب جدید تحقیق کے اصولوں کے مطابق لکھی گئی۔ پھر میرے اپنے عہد کی بڑی دانشور فہمیدہ ریاض نے مزدک پہ ناول

مزدک Vol-1

کی ایک آدھ قسط لکھ دی۔ اِن سارے استادوں محققوں کی چوکھٹ سے تنکا تنکا چُن کر میں نے یہ گھونسلا بُنا ہے۔

مزدک کے بھاری اور عزت دار نام سے پانچویں صدی عیسوی میں ایک بہت بڑی انقلابی تحریک ابھری۔ واضح رہے کہ جب بھی ہم انقلاب کی بات کرتے ہیں تو اُس سے مطلب 21ویں صدی کا انقلاب نہیں ہے۔ ظاہر ہے جدید ترین ٹکنالوجی اور جدید ترین معاشی معاشرتی زمانے کا انقلاب بہت مختلف ہوتا ہے پانچویں صدی عیسوی کے انقلاب سے۔ اس لیے مزدک اور اس کی انقلابی تحریک کو پانچویں صدی عیسوی کے پس منظر میں دیکھنا چاہیے۔ چنانچہ ہم اُس ایرانی سلطنت کی بات کر رہے ہیں جب وہاں ساسانی دور ہوا کرتا تھا۔ یہاں کا بادشاہ کباد نام کا تھا۔ یہ تحریک ساسانی بادشاہ قباد کے دور میں اثر پکڑ چکی تھی۔ اس زمانے میں ایران اور اس کا پڑوسی روم دو بڑی سلطنتیں ہوا کرتی تھیں۔

مزدک اپنے زمانے اور سماجی معاشی حالات کی مطابقت میں ایک فلسفیانہ معاشی سیاسی اور مذہبی تعلیمات کا بانی اور راہبر ہے۔ یہ زرتشتی مذہب کی خالص کردہ اور اصلاح کردہ شکل ہے۔

بام داد کا بیٹا مزدک خود ایک زرتشتی مولوی تھا جنہیں ''موبذ'' کہا جاتا تھا۔

کچھ میرا دل کرتا ہے، اور کچھ شواہد چغلی کھاتے ہیں کہ مزدک کا بلوچوں سے ایک تعلق موجود ہے۔ میں مردوں عورتوں کے کچھ بلوچی نام دینا چاہ رہا ہوں۔ اِن سب کے آخر میں ''ک'' آتا ہے: شیھک، نوحک، زرک، پیرک، سیمک ....اور مزدک!! اُس دور کے دوسرے چند نام ملاحظہ ہوں: '' بڑزیں ، درفش ، روز مہر............'' مہرداد، بام داد، بغداد (باغ+داد، خدا کا دیا ہوا)۔ اِس لیے میں ڈبل دلچسپی کے ساتھ یہ کتابچہ لکھ رہا ہوں۔ بڑا مقصد تو ظاہر ہے ''عشاق کے قافلے'' کی انسان دوست لسٹ کی تکمیل ہے۔ بس اس خواہش کے ساتھ کہ یہ بلوچ اور انسانی مقدس تعلق ابد تک جاری رہے۔

مزدک اور اُس کی تعلیمات کے بارے میں اُس قدر مواد موجود نہیں ہے جو کہ ہونا چاہیے

تھا۔ اس سلسلے میں فردوسی، طبری، خیال امروہوی، اور براؤن کی چوکڑی نے میری مدد کی۔ اصل منبع فردوسی ہے۔ خیال امروہوی نے اپنی پی ایچ ڈی کی ڈگری تہران سے لی۔ اور اس کو کتابی صورت میں فارسی زبان میں شائع کیا ''عقائد مزدک'' کے نام سے۔ یہ کتاب جدید تحقیق کے اصولوں کے مطابق لکھی گئی۔ مگر یہ اردو (اور اب تو فارسی میں بھی) ناپید ہے۔ پھر میرے اپنے عہد کی بڑی دانشور فہمیدہ ریاض نے مزدک پہ ناول کی ایک آدھ قسط لکھ دی۔ اِن سارے استادوں کی چوکھٹ سے تنکا تنکا چُن کر میں نے گھونسلا بُنا ہے۔

ہمارے اِس خطے میں بہت زمانہ قبل زرتشتی مذہب ہوا کرتا تھا۔ اس کے بے شمار پیشواؤں میں سے ایک لیڈر تھا، مزدک نام کا۔ وہ اسلام سے بہت پہلے والے اس مذہب کے پیروکار ساسانی بادشاہ، کباد اول کے زمانے میں زبردست قوت والا آدمی تھا۔ اس نے خود کو زرتشی مذہب اور فلسفہ کا رسول ہونے کا دعویٰ کیا۔ اس نے بڑے پیمانے پر سماجی بہبود کے پروگرام شروع کر دیے۔ اسے اولین سوشلسٹ ہونے کی شہرت حاصل ہے۔

یہ نہ تو اس مضمون کا موضوع ہے اور نہ ہی آج کے ہمارے نوجوانوں کو اس بات سے خاص دلچسپی ہے کہ پانچ سو برس قبل مسیح، قدیم پارس میں ایک ہخامنشی سلطنت وجود رکھتی تھی۔ ہمارا موضوع یہ بھی نہیں ہے کہ زرتشتی عہد میں ہخامنشی ایک مقبول اور مشہور ترین حکاموں میں سے ایک تھا۔ ہخامنشی پارس اور مشرقی بلوچستان، ترکی کے کچھ حصوں کے حکمرانوں کی یادداشتوں کی کچھ لائنیں یوں ہیں جو پانچویں صدی قبل مسیح میں غاروں یا پتھروں پہ لکھی تھیں:

شی کشایارش، منا پتا

وِشتاسپ، وشتاسپاہیا پتا ارشم،

ارشم ہی آ پتا آریا رمن،

آریارمن ہی آ پتا چِش پِش ہی آ پتا ھخامنشی

آج کی بلوچی میں:

گشی خشایارشا،منی پث ات

وِشتاسپ ،دشتاسپ آنہی ءِپت ات

ارشم،ارشم آنہی پت ات،آریارمن،

آریارمن آنہی پت ات،چِش پِش

آنہی پت ات ہخامنشی

اس بات کا تذکرہ بھی مجھے لاحاصل لگتا ہے کہ وہاں ایک ہخامنشی کندہ شدہ تحریر میں ''دراویش'' اور کاش یراش کی یادگار کتابوں میں لکھے مشہور فقرے یہ ہیں:

بگ وَ زَرک اہورمزدا،اھیہ ایمام بومیم اَدا،

اَوَمَ آسمانم اَدا ھیہ مرتیم ادا،

ھیہ شیا تیم اَدامرتہیّا

آج کی بلوچی میں یہ یوں ہوگا:

اھورمزدا یک مزن بگ،آنہیا

اے زمین وآسمان دات آنہیا مردم داتہ،

آنہیا شاتی داشہ مردما

ہم تو اُس عہد سے پورے ایک ہزار برس بعد کی بات کر رہے ہیں۔چوتھی صدی عیسوی کا ساسانی عہد۔یہ زمانہ اور بادشاہت بلوچستان، وسطی ایشیا، بلخ اور ہندوستان کی تاریخ میں بہت مرکزیت والی فیوڈل بادشاہتوں میں شمار ہوتا ہے۔وہاں زرتشتی مذہب کو ریاستی مذہب کا درجہ حاصل تھا۔یزدان،اُن لوگوں کے خدا کا نام تھا۔اوستاان کے مذہب کا مذہبی صحیفہ تھا ۔

زرتشت کے مذہب کے بارے میں ذرا سی جانکاری ہمیں مزدک اورمزدکیت کے بارے میں کافی معلومات دے گی۔زرتشت اوراُس کا زرتشی مذہب اسلام سے قبل کا تھا۔اب سکالر اس بات پہ متفق ہیں کہ زرتشت بارہ سویا ایک ہزار قبل مسیح کے درمیان پیدا ہوا تھا۔ایک دلچسپ روایت اُس کی پیدائش سے متعلق یہ مشہور ہے کہ وہ پیدا ہوتے وقت رو نہیں رہا تھا بلکہ ہنس رہا تھا(1)۔اُس کے مذہب میں اہورا مزدا عبادت کا ارفع ترین خدا تھا۔اہورا ہے روشنی ، اورمزدا: دانائی۔آگ خدائی نور کی بہترین مثال تھی۔ یہ زرعی مذہب تین بنیادی قوانین پہ استوارتھا: نیک سوچیں، نیک باتیں اورنیک کام ۔یہ مذہب پہلی بار ہخامنشیوں کے عہد میں نظر آیا۔وہاں دعائیں پڑھتے ہوئے تین بار ہاتھ دھوئے جاتے تھے۔تین بارمنہ دھویا جاتا تھا۔تین کلیاں کی جاتی تھیں۔نم انگلیوں کوکانوں اورگردن کی پشت پرتین بارپھیرا جاتا تھا۔داڑھی میں تین باربھیگی انگلیاں گھسیڑ دی جاتی تھیں۔ اسی طرح بھیگا ہوا ہاتھ سر کے بالوں پرپھیرا جاتا۔چلومیں پانی لے کر کہنیوں تک بازو دھوئے جاتے تھے۔پیر بھی تین بار دھوئے جاتے تھے۔تبھی تجدیدِ آتش کے لئے تیار سمجھا جاتا تھا۔(2)۔

زرتشتیوں کے مطابق دنیا کا وجود اوراس کی بقا زراعت سے ہے۔اوستا میں یوں لکھا تھا:''اور وہ لوگ جو دونوں بازؤں سے زمین کو کاشت کرتے ہیں،اُن سے زیادہ مبارک اورسعید ہستیاں روئے زمین پرنہیں۔سلامتی ہواُن پر،اورخوشی اُن کے گھروں کوبھر دے۔معزز ترین،عظیم ترین،مبارک ترین ہیں وہ جوغلہ بوتے ہیں،اُسے سینچتے ہیں اوراُسے کاٹتے ہیں۔تاریکی اورغم اُن کے گھروں سے دور رہیں گے۔اُن کے گھر ہمیشہ روشنی سے معمور۔۔۔۔وہ اہورامزدا کی تخلیق کے منصوبے کو پورا کرتے ہیں اور جب جَو کی بالیاں پکتی ہیں تو اہرمن (شیطان) کا رنگ فق ہوجاتا ہے اور جب دانے اُن کے گھروں میں آتے ہیں تو ارواحِ بد، زاروقطار روتی ہیں اور جب اناج پیسا جاتا ہے تو تاریکی اور بدی اوراہرمن ان کے گھروں سے سرپٹ بھاگ نکلتے ہیں کیونکہ اناج اور آٹا اُن کی موت ہے''۔

اُن کے ملاّؤں کے لئے فرمان تھا کہ ان کے ہاں گوشت نہیں پکے گا۔حیرت ناک بات یہ ہے کہ ملاّ یعنی موبد کو گوشت کھانے کی ممانعت تھی۔موبد صرف سال بھر کا اناج اپنے گھر میں رکھ سکتے تھے۔اسی طرح وہ کپڑے بھی اتنے ہی بنا سکتے تھے جو سال بھر کے لئے کافی ہوں۔اس دین

کے مطابق موبدوں کو کاروبار کرنے اور تجارت کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ مگر ہم دیکھیں گے کہ ان موبدوں نے آہستہ آہستہ اپنے مذہب میں اپنے لیے گنجائش نکال ہی لی۔ چنانچہ زرتشتی ملاؤں نے اپنے مذہبی احکامات کے برعکس دنیاوی دھندے شروع کر دیے۔ وہ اپنی متعدد حویلیوں کے گوداموں میں اناج بھرے رکھتے تھے اور ریشم و کم خواب کے لباس بنواتے تھے۔ بے شک وہ اپنے آتش کدوں میں سادہ چوغے میں آتے تھے لیکن ان کی شامیں اور راتیں اشرافیہ (وزرگان) اور امراء کے محلات میں گزرتی تھیں جہاں اُن کے زرق برق چغے امراء کے بیش قیمت لبادوں سے کچھ کم نہ ہوتے تھے''۔

موبد اور وزرگان بہت بااثر اور طاقتور طبقات تھے۔ وہ بادشاہ گر تھے۔ بادشاہ اُن سے خوف کھاتا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سماج میں زرتشتی ملاّؤں کی بالادستی تھی۔ یہ ملا بادشاہ بناتے گراتے تھے۔ ہم اُس زمانے کی بات کر رہے ہیں کہ جب طبقاتی ڈھانچے میں بادشاہ قباد ولد فیروز سب سے اوپر متمکن تھا۔ اس کا ایک بیٹا کاوس تھا، دوسرا بیٹا خسرو، تیسرا ازم۔ اس حکمرانی میں اُن کے بعد سب سے بڑے مذہبی راہنما موبد موبدان (ملاّؤں کا ملاّ) کا نمبر آتا تھا، پھر ملاّ یعنی موبدان تھے۔ یہ وہ روحانی پیشوا تھے جو آتش کدوں کے نگہبان اور زرتشتی مذہب کے رکھوالے تھے۔

اسی طرح حاکمیت میں خود غرض اشرافیہ طبقہ (وزرگان) شامل تھا جو کہ حکمران طبقات میں شمار ہوتا تھا۔

اُن میروں معتبروں اور ملاؤں کی دو قسم کی بیویاں ہوا کرتی تھیں۔ ایک تو اصلی بیوی ہوتی تھی۔ اصلی بیوی کو ''زن پادشائی'' کہا جاتا تھا یعنی اولین بیوی جو اصل بیوی شمار ہوتی تھی۔ مگر اس کے علاوہ اُن کی ایک یا کئی دوسری بیویاں بھی ہوتی تھیں جو محض خادمہ ہی نہیں، بیوی بھی تھیں۔ اُسے وہ اپنی ''زنِ چگاری'' کہتے تھے یعنی ایک ''خدمت گار بیوی''۔ جسے بوقتِ ضرورت دوستوں یا رشتے داروں کو عاریتاً دیا جا سکتا تھا۔ وہاں نوعمری ہی میں شادی کر دی جاتی تھی۔

ان سب سرداروں، اور ملاؤں کو پالتے کسان (دھقانان) تھے۔ جو کہ نچلے طبقات تشکیل دیتے تھے۔ ان دھقانوں کو ایک لحاظ سے غلام کی حد تک پست رکھا گیا تھا۔ وہی جنہیں آج کل ''کھیت مزدور'' کہتے ہیں۔ وہ اُن زمینوں پہ کام کرتے تھے، جو مالکان کی طرف سے اُن میں تقسیم کی جاتی تھیں۔ یہ لوگ مالکان کو زمین کا مالیہ (خراگ، یعنی خراج) ادا کرتے تھے۔ (3)۔

اسے اس قدر پختہ طبقاتی نظام بنا دیا گیا تھا کہ طبقات خاندانی طور پر فکس ہوا کرتے تھے۔ یعنی موچی کا بیٹا پوتا، پڑپوتا کسی بھی صورت موچی کا کام ترک نہیں کر سکتے تھے۔ اور فیوڈل کا بیٹا فیوڈل۔ انسانی تحقیر و تذلیل عام تھی۔ ''شاہنامہ'' میں فردوسی نے خواہ جس قدر بھی شاعرانہ مبالغہ کیا ہو مگر کچھ تو تھا جس پر اُس نے یہ کہانی منظوم کی تھی۔ وہ روم کی طرف نوشیروان کی لشکر کشی کے بارے میں لکھتا ہے کہ اخراجات کے لئے رقم کم پڑ گئی:

ازاندازۂ لشکرِ شہر یار
کم آمد ز دینار سئے صد ہزار

تو بادشاہ نے حکم دیا کہ بازرگانوں اور دہقانوں سے مطلوبہ رقم قرض لیا جائے۔ ایک جوتا فروش حاضر ہوا اور رقم بادشاہ کے حوالے کی اور بفرستادۂ خسرو سے کہا: ''میں چالیس بار، صد ہزار درم لاؤں گا اور بادشاہ کے سپرد کر دوں گا۔ اور اس کے عوض محض ایک آرزو اور استدعا رکھتا ہوں۔ وہ یہ کہ بادشاہ میرے حق میں استثنا کر کے اجازت دے کہ مجھ موچی کا بیٹا مکتب چلا جائے اور سبق پڑھے۔ مگر شاہ نے ایسی خواہش رد کر دی اور کہا:

گفت شاہ اے خرد مند مرد
چرا دیو چشم ترا خیر ہ کرد
برو ہمچنان باز گردان شتر
مبادا کزوبیم خواہیم و در
چو بازاگان بچہ گردد دبیر
ہنر مندو بادانش و یاد گیر
چو فرزند ما برنشیند بہ تخت
دبیری ببا یدش پیروز بخت
ہنر یا بداز مرد موزہ فروش

سپارد بدو چشم بینا و گوش
بما بر پس مرگ نفریں بود
چو آئین ایں روزگاراں بود

عام آدمی کا بچہ سکول نہیں جا سکتا تھا، نہ دھوبی اور کسان اپنا آبائی پیشہ تبدیل کر سکتے تھے۔ یعنی جاگیردار کو جاگیردار رہنا تھا اور کسان کو کسان ہی رہنا تھا، نسل درنسل۔ بھلا اتنا منظّم مذہب بعد میں کسی نے دیکھا؟۔(سولہ صدیاں گزرنے کے بعد، آج بھی ہمارا فیوڈل، بالکل خسرو بادشاہ کی طرح سوچتا ہے)۔

صرف بادشاہ تو اس نظام کو برقرار نہیں رکھ سکتا تھا: اس لیے اوستا (مذہبی کتاب) کے چوکیدار اور آتشکدہ کے ٹھیکیدار موبد نے حسبِ معمول اُس کا ہاتھ بٹا رکھا تھا۔ اُس نے اس بدترین طبقاتی نظام کو عوام الناس کے سامنے یزدان (خدا) کا حکم بتلا دیا تھا۔

ساسانی دور سلطنت میں عوام کا استحصال اور ظلم اپنی انتہا کو پہنچ چکے تھے۔ غلام داری عروج پر تھی اور وہی بحران کا سبب بھی تھی۔ فیوڈل اشرافیہ کے ناقابل برداشت ستم کے نتیجے میں غریب کسان اپنے گھر بار، ہلک و گاؤں چھوڑ کر شہر کی طرف بھاگنے لگے۔ اِس طرح شہروں کی جانب زبردست مائی گریشن ہوئی۔ مگر شہروں میں بھی انہیں غلام ہی برتا جاتا تھا۔

وہاں شہر میں ہر کوچے میں کوئی نہ کوئی آتش کدہ بنا لیا گیا تھا۔ یہ آتش کدے موبدوں اور ان کے چیلے چانٹوں کے روزگار کا ایک ذریعہ تھے۔ یہ موبد، اور اس کے مددگار و معاون غریبوں سے ہر رسم کے لئے جبری چڑھاوے طلب کرتے تھے۔ جبر اور لالچ اُن کے مزاج میں سرائیت کر چکے تھے۔ وہاں اُس آتش کدے میں، اُن کا دھیان آتش مقدس کی طرف نہیں، بلکہ آنے والوں سے نذرانے وصول کرنے کی طرف لگا رہتا تھا۔ اُس وقت ذہن میں یہ سوال آتا تھا کہ اس قدر آتش کدوں کی کیا ضرورت ہے!۔ عبادت گاہیں جتنی زیادہ ہوں گی دھرم کی قدر و قیمت اُسی قدر کم ہوتی جائے گی۔ ملاّ جس قدر زیادہ ہوں گے اُن کی عزت و توقیر اسی نسبت سے کم ہوتی جائے گی۔ ڈیمانڈ اور سپلائی کا سادہ اصول!!۔ مگر وہ اس کا حل یہ نکالتے رہے کہ خوفزدہ کرنے والی چیزوں اور بلاؤں کی تعداد میں اضافہ کرتے جاتے تھے۔ وہ آتش کدوں کے ماننے والوں کی تعداد بھی بڑھاتے جاتے تھے اور ورد اور عبادتوں میں بھی اضافہ کرتے جاتے تھے۔

عجیب اتفاق تھا کہ قرض دینے اور اُس پر منافع لینے کا رواج آتش کدوں سے شروع ہوا تھا۔ موبدان کے پاس وزرگان کے گراں قدر نذرانوں اور غریب غربا کے چھوٹے موٹے چڑھاووں سے اتنی دولت جمع ہوگئی تھی، اور اتنا مال و اسباب اکٹھا ہوا تھا کہ انہوں نے اول اول تجارتی قافلوں کو دوسرے شہروں اور مملکتوں میں فروخت کرنے کے لیے اناج قرض دینا شروع کیا تھا۔ وہ منافع کا ایک حصہ خود لینے لگے۔ پھر چھوٹے دکانداروں اور مزدوروں کو اناج یا سکوں کے قرضے دینے کا آغاز ہوا۔ اس میں مقروض کا نفع نہ ہوتا تھا لیکن اضافی مال اُن سے لینا ضروری تھا .....(4)۔

اشرافیہ طبقہ دولت بھی بے حساب رکھتا تھا اور اُن کے پاس عورتیں بھی بے شمار تھیں۔ امیر لوگ کھانے پینے کی اشیاء بڑے پیمانے پر ذخیرہ کرتے تھے۔ اِس حد تک کہ مصنوعی قحط پڑ جاتی تھی۔
ہم فردوسی کی طرف رجوع کرتے ہیں:

زخُشکی ''خورش'' تنگ شد در جہاں

(ذخیرہ اندوزی سے اس عہد میں قحط پڑ گیا تھا)

تاریخ میں تذکرہ ہوا ہے کہ ''والی آذربائیجان، مغضوب انوشیروان واقع گردید''۔ یہ والی وہی شخص ہے جس کی داستان یا افسانہ ایک بوڑھی عورت نے سنائی تھی۔ کہتے ہیں کہ وہ بڑھیا بادشاہ کے پاس شکایت لے کر گئی اور بادشاہ نے تحقیق کے بعد جانا کہ بوڑھی عورت نے سچ کہا ہے۔ پھر بزرگ لوگ پیش ہوئے۔ اُن سے بادشاہ نے پوچھا کہ آذربائیجان کے والی کے پاس کتنی دولت ہوگی۔ جواب ملا کہ دو ملین دینار۔ پوچھا کہ متاع و تجمل کی مالیت کیا ہوگی؟۔ جواب آیا کہ وہ تین سو ملین دینار زرینہ و سیمینہ رکھتا ہے۔ پوچھا جواہر میں اس کے پاس کیا ہے۔ کہا پانچسو ملین دینار۔ پوچھا ملک و مستغل وضیاع کتنا رکھتا ہے۔ جواب آیا خراسان و عراق آذربائیجان ایسا کوئی ناحیت اور شہر نہیں ہے جہاں اس کے پاس دس پارچہ اور سات پارچہ ملک اور دہ و آسیاب و کاروان سرائے اور

حمام اور مستغل نہ ہوں۔ پوچھا چوپایہ کتنا رکھتا ہے۔ کہا تیس ہزار۔ پوچھا بندہ درم خریدہ کتنا۔ بولے ایک ہزار سات سو غلام رومی اور حبشی درم خریدہ رکھتا ہے اور چار صد کنیزیں۔(5)۔

فردوسی نے بادشاہ کی بے حد وحساب دولت کا تذکرہ یوں کیا تھا:

''اس کی ہزاروں کنیزیں تھیں جو فصلِ بہار کی طرح تروتازہ تھیں، اُن کی کمر پہ سونے کی پٹیاں لپٹی ہوتی تھیں''۔

باشاہ کا حرم فردوسی کے بیان سے دیکھیے:

بہ مشکوی زرین دہ ودہ ہزار
کنیزک بہ کردار خرم بہار

یعنی: خرم بہار کی مانند جوان دواز دہ ہزار عورتیں اس کے حرم سرا میں تھیں۔

اہل کار دندناتے ہوئے رعایا کے گھروں میں گھس کر تلاشیاں لیتے۔غریب غربا اور کمزوروں کی بہو بیٹیاں گھسیٹ کر اپنے آقاؤں تک پہنچادیتے۔امرا کی عیاشیاں زوروں پہ تھیں۔مگر اب، اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ وہاں اس زمانے میں کوئی ''لاک ہیڈ'' نامی ملٹی نیشنل جہاز ساز کمپنی موجود تھی جو اُن نوابوں ملاؤں کے لیے جہاز بناتا، اور نہ ہی اُس زمانے میں تھائی لینڈ کے چکلے موجود تھے۔ برطانیہ ودبئی کے شاپنگ سنٹر بھی ابھی وجود میں نہ آئے تھے..........مگر اُس زمان میں موجود میسر ساری عشرتیں انہیں حاصل تھیں۔

اسی طرح طبری نے اپنی تاریخ میں لکھا کہ خسروانوشیروان نے مالیاتی وضع کے بعد ایک جلسہ کیا تا کہ ''جس کسی کو کوئی اعتراض ہو تو اظہار کرے''۔اس نے مجمعے سے یہ سوال پوچھا تو سب خاموش رہے، دوسری بار بھی یہی ہوا۔اور جب بادشاہ نے تیسری بار اپنے سوال کو دہرایا تو ایک شخص اپنی جگہ سے اٹھا اور احترام سے پوچھا کہ بادشاہ اس خراج کو دائمی رسم ناپائیدا شیا پر تحمیل کرنے کا فرمایا ہے اور یہ بمرور زمان دراخذ خراج ممکن ہے موجب ظلم ہوگا۔بادشاہ چیخ پڑا کہ اے مردِ ملعون و مردود، تم کس طبقہ سے تعلق رکھتے ہو؟۔اس نے جواب دیا دبیروں کے طبقے سے۔پس بادشاہ نے حکم دیا کہ اسے قلمدان کے ساتھ اس قدر پیٹا جائے کہ وہ مرجائے۔سارے حضار اٹھے اور اس شخص کو قلمدانوں سے اس قدر مارا کہ وہ ہلاک ہوگیا۔اسی وقت سارے حاضرین بہ یک آواز کہنے لگے۔''خسرو! جو خراج آپ نے مقرر فرمائے وہ سب مبنی بہ انصاف ہیں''۔

اس سارے خوف ناک پس منظر میں شاہ پور اول کے دور میں ایک نیا مذہبی رہنما مانی نمودار ہوا۔وہ ایرانی ماں باپ سے اپریل 216 عیسوی میں پارتھیائی میسوپوٹیمیا میں پیدا ہوا۔(6)

مانی کا باپ ''پاتک'' ایرانی ہمدان سے نقل مکانی کر کے اِس جگہ پر آیا جہاں ''صابی'' مذہب کے پیروکار تھے۔یہ لوگ بہت صفائی پسند تھے۔غسل اور، اور صاف لباس ان کا وطیرہ تھا۔پاتک کو ان کا مذہب اچھا لگا، وہ اس میں بھرتی ہوگیا۔

ان لوگوں کی زبان ''آرامی'' تھی جو عربی کے نزدیک ہے۔پاتک نے اپنے بیٹے مانی کو بھی اس مذہب میں شامل کرالیا۔

فارسی تو تھی ہی، اب مانی نے آرامی زبان میں بھی مہارت حاصل کی۔انجیل کی زبان بھی مخلوط آرامی وعبرانی تھی۔مانی نے انجیل وتورات سے واقفیت حاصل کی۔

دنیا کے سارے مذاہب کے بانیوں کی طرح مانی بھی ایک مشکل دور اور مقام میں پیدا ہوا۔وہ بہت سیلانی آدمی تھا۔گھومنا پھرنا۔ایران کے مشرقی حصہ میں بدھ مت موجود تھی۔اس کے کچھ نکات سے وہ متاثر ہوا۔زرتشتی سے وہ پہلے ہی آشنا تھا۔اس نے ایرانی مذہب زرتشتی اور مسیحیت، اور صابی اور بدھ مت کی نمایاں خصوصیت سے ایک مرکب تیار کی۔اس نے مذہبی texts اور litergies کا ایک سلسلہ لکھا، اُن میں سے کچھ بہت خوبصورت تھے۔وہ خاموشی سے اپنے مذہب کا پرچار کرتا رہا۔جب ساسانی بادشاہ شاہ پور (AD 243) بھی اس نئے مذہب میں شامل ہوگیا تو گویا یہ ریاستی سرکاری مذہب بن گیا۔تب وہ آزادانہ طور پر اپنے مذہب کا پرچار کرنے لگا۔

وہ اوستا کو بہت اچھی طرح سمجھتا تھا۔وہ ایک پاک صاف فنکار تھا۔مانی نے خود کو یسوع مسیح کا سب سے بڑا اور آخری حواری جتایا۔اس کے نام کی نسبت سے چلنے والی تحریک اور عقیدے کا نام ''مانویت'' پڑا۔ مانویت نے اس سماجی ڈھانچے کو غیر منصفانہ قرار دیا اور اس پر زبردست تنقید کی

۔ یہ تحریک آگ کی طرح پھیل گئی اور بہت کم عرصے میں دور دور تک پھیل گئی ۔ یہ فارس کی سرحدوں سے باہر ہند، یورپ اور وسطی ایشیا تک پھیل گیا۔ ایک ایسی تحریک جس سے ہمارے اِس خطے کے غلام داری سماج میں زبردست ہلچل مچ گئی۔ ایسے میں جب دوسرے علاقے بھی مفتوحات میں شامل ہوتے رہے تو اس غلام دارانہ سماج کے بالائی طبقے کو تو زبردست دولت ملی مگر ساتھ ساتھ سماج کے اندر بڑھتے ہوئے بحران میں بھی شدت پیدا ہوتی گئی ۔ کئی بغاوتیں ہوئیں مگر کوئی بڑی کامیابی نہ مل سکی۔

یہ مذہب ہمارے خطے میں دیر تک برقرار رہا۔ کھلے مذہب کے بطور، بغیر کسی پکڑ دھکڑ کے، بغیر پابندی کے۔ مانی نے خود کو آخری پیغمبر قرار دیا۔

ابوریحان ''الا ثار الباقیہ'' میں ابن ندیم کی کتاب ''الفہرست'' کے حوالے سے لکھتا ہے کہ مانی نے سات کتابیں لکھیں۔ وہ مصوری کے فن میں بہت ماہر تھا۔ اس نے اپنی تحریریں مختلف زبانوں میں ترجمہ کرائیں۔(7)

............مگر طبقاتی سماج اس قدر مضبوطی سے بالا دست طبقے کی مٹھی میں تھا کہ مانی زیادہ عرصہ زندہ نہ رہ سکا۔ ملاّؤں کی نظر میں اس کا فرقہ ہمیشہ despised رہا اور اسے heretical سمجھا گیا۔ نہ صرف زرتشتیوں کے ملاؤں کی طرف سے بلکہ یہودی، مسیحی ملاؤں کی طرف سے بھی۔ وہ ان کے ہاتھوں قید ہوا، اور بھاری زنجیروں کی اذیتیں سہتے سہتے 277 عیسوی میں قتل ہوا۔ اس کی تعلیمات کی کوئی تحریری صورت گری نہ ہو سکی۔ اس کے بعد اُس کے پیروکار روپوش ہو گئے ۔ کچھ لوگ وطن چھوڑ گئے ۔ مانی کے پیروکار اس قدر دہشت زدہ ہوئے کہ خفیہ خفیہ سینوں میں تعلیمات دبائے صرف اس قابل ہی تھے کہ اپنی اولاد تک انہیں منتقل کر پائیں۔

تین سو سال تک مانویت ایک بڑے مذہب کے بطور زندہ رہا۔ مگر زیر زمین ۔ بام داد، نامی مانوی نے بھی یہی کچھ کیا۔

مانی کی موت سے تین صدیاں بعد مانی کا پیروکار بام داد، انڈر گراؤنڈ تھا ۔ وہ اپنے دوسرے ہم عقیدہ لوگوں کی طرح خفیہ خفیہ مانی کے دین کی تبلیغ کرتا تھا۔ اپنے قریبی اور خون کے رشتے کے لوگوں پر۔ یہی کچھ وہ اپنے بیٹے مزدک کو بھی سکھاتا تھا۔ اس نے مزدک کو مانی کی تعلیمات بتائیں۔ مزدک جو کہ موبد (آتش پرستوں کا ملاّ) تھا۔

باپ کا اکلوتا بیٹا تھا، مزدک ۔ (مزداد، مزدا کا دیا ہوا، جیسے کریم داد، رحیم داد، ملک داد، شہداد وغیرہ)۔ بام داد نے مانی کی تعلیمات سے اپنے ہونہار بیٹے مزداد (مزدک) کو مالا مال کر دیا۔ اور جلد ہی مزدک اوستا کا سمجھو حافظ بن گیا۔ اتنا بڑا عالم کہ وہ خود ایک معتبر موبد تھا اور شاہی دربار میں اس کی الگ اور ممتاز نشست رکھی ہوتی تھی۔

بیا مد یکے مرد مزدک بنام
سخنگوی و بادانش ورای کام
گرانما یہ مردے و دانش فروش
قبادِدلاور بدودا دہ گوش
بہ نزد شہنشاہ دستور گشت
نگہبان آں گنج و گنجور گشت

شاہی دربار تو دنیا بھر میں ایک جیسے ہوتے ہیں۔ باہر کو نکلی غلیظ توندوں اور ابلیسی دلوں دماغوں والی اشرافیہ کی مجلس۔ یہاں قباد کے دربار میں کُرسیوں پر تشریف فرما محنت سے ناآشنا امرا، شہزادوں اور پنڈتوں کے گودام، سڑ جانے اور خراب ہو جانے کے لئے غلے سے بھرے پڑے تھے۔ اور باہر شدید ترین قحط سالی میں قرض میں ڈوبے عام انسان کی اموات ہو رہی تھیں۔

............موت، بھوک کی موت۔

بام داد کی عطا کردہ مانی کی تعلیمات سے منور اس پاکیزہ زرتشتی' مزدک کے سامنے یہی سماجی عوامل تھے۔ زمینداروں' اشرافیہ' اور روحانی پیشوا اور مفلسوں کے درمیان طویل کش مکشوں کا سلسلہ جاری تھا جس سے ایک نئے عوامی انقلاب کی راہ ہموار ہو رہی تھی ۔ مزدک اِس صورتحال کو خوب دیکھ اور پرکھ رہا تھا۔ اُس نے مانی کی تعلیمات کے اطلاق کی راہیں ڈھونڈنی شروع کیں۔

مزدک مانوی مذہب کے برخلاف سمجھتا تھا کہ ترک دنیا کوئی ضروری جزو دین نہیں۔ اس

نے نچلے طبقے کی اکثریت کی طرف اپنی توجہ مبذول کی۔ اس نے عورتوں کی نجات کا فارمولا مرتب کیا۔ بے جوڑ شادیوں کو مسترد کیا جس مین پیسے والا بوڑھا کثروسٹ نوعمر حسین لڑکیاں بیاہ لاتے۔ (8)

فردوسی اپنے ''شاہنامہ'' میں بتاتا ہے کہ ''مزدک نے دربار میں کھڑے ہوکر بادشاہ سے سوال کیا کہ: ''اگر کسی کو سانپ کاٹ لے اور کسی آدمی کے پاس ''تریاق'' موجود ہو اور وہ دینے سے گریز کرے تو اُس کی سزا کیا ہونی چاہیے؟''۔ بادشاہ نے جواب دیا: ''خونی است آں مرد تریاق دار ''(تریاق رکھنے والا آدمی قاتل ہوگا)۔ مزدک نے دوسرا سوال پوچھا: ''اگر کوئی بھوکا ہو اور کسی دوسرے شخص کے پاس روٹی موجود ہو اور وہ نہ دے تو اُس کی سزا کیا ہونی چاہیے؟''۔ بادشاہ نے جواب دیا کہ ''خونی است ناکردہ، درگردنش'' (ایسے آدمی کی گردن پر خونِ ناحق متصور ہوگا)۔

مزدک نے وہیں بادشاہ کی باتوں کو اپنے حق میں استعمال کیا اور لوگوں سے کہا: ''جس جگہ بھی غلے کا ذخیرہ موجود ہواُسے لوٹ لیا جائے (9)۔

.......اور قیامت آگئی۔ روز مہر کے قصر میں اور طیسفون کے لاتعداد محلات میں .....روز مہر کا خاندان، اس کی حسین، نازک اندام بیٹیاں، اس کی عمر رسیدہ زن پادشائی، متعدد زن چگاریا ں، درجنوں خانگی غلام اور خدمتگار، قصر کے اندرون خانہ گول گھومتی سنگ سرخ کی سیڑھیوں پر لرزہ براندام قطار میں کھڑے تھے جو اوپر روز مہر کی مزین خوابگاہ تک جاتی تھی۔ نیچے بدحال میلے کچیلے کسانوں، مزدوروں اور کان کنوں کا غول اس کے آراستہ وپیراستہ مہمان خانے کا اسباب لوٹ رہا تھا۔ وہ شور مچاتے ہوئے غلیظ انگلیوں سے بیش بہا آرائشی نوادرات کو الٹ پلٹ رہے تھے، جن کی قدروقیمت کی انہیں کچھ خبر نہ تھی اور انہیں اچھال اچھال کر اپنے لمبے لمبے تھیلوں میں بھر رہے تھے جواُن کی بیویوں نے جلدی جلدی سیئے تھے......(10)۔

وہ مذہب میں اصلاح کرکے اُسے حکمران عقیدہ بنانا چاہتا تھا۔ اس کا ماننا تھا کہ اس نے اندھیر پہ روشنی اور اہورا مزدا کا Angro main Yus پر وعدہ کردہ فتح تک پہنچنے کے ذرائع دریافت کرلیے ہیں (11)۔ اس نے جائیداد کے لالچ اور عورت کی شہوت کو مردوں میں ساری برائی کے اسباب قرار دیا۔ اُس نے جائیداد کو مشترک قرار دے کر اِن ساری برائیوں کو دور کرنے کی خواہش کی۔

اور مزدک اُن کسانوں سے یوں گویا ہوتا: ''میرے بھائیو! یہ دنیا، یہ زمین یہ پانی، خدائے بزرگ وبرتر نے تخلیق کیے ہیں۔ یہ کسی ایک کی ملکیت کیسے ہوسکتے ہیں؟۔ ان پر گرمی سردی میں رات دن محنت تم کرتے ہو۔ بیج تم بوتے ہو۔ اناج اُگتا ہے۔ وہ تمہارا ہے۔ اناج اُس کا ہے جو محنت کرکے اسے اُگاتا ہے۔ یہ تم ہو جو محترم وقابلِ تعظیم، مستحق ثنا، اہورمزدا کے منصوبے کی تکمیل کرتے ہو کہ زمین ہری بھری رہے، اناج، پھل پھول پیدا کرے۔ یہ وزرگان اور دبیران اور امراء تو چور لٹیرے ہیں۔ تم اُن سے اپنا حق چھین کیوں نہیں لیتے؟''۔

مزدک یہ بھی کہتا ہے۔ ''امراء سے یہ کہنا، کہ وہ اپنے محلات، ہزاروں غلاموں، کنیزوں، بیویوں، لذیذ ترین غذاؤں، غلے سے بھرے گوداموں، گھوڑوں سے پُر اصطبلوں پر قناعت کریں، اور ایک مزدور سے یہ کہنا کہ وہ اپنے جسم کے چیتھڑوں پر، اپنے فاقوں پر قناعت کرے، کیا ایک ہی مطلب رکھ سکتا ہے؟۔ قناعت کے معنی یہ نہیں ہوسکتے۔ اس کا اصل مطلب یہ ہی ممکن ہے کہ جب کہ سب کے پاس ان کی حقیقی ضروریات کے مطابق چیزیں موجود ہوں تب وہ ایک دوسرے کی چیزیں نہ چھینیں، ہوس کا شکار نہ بنیں۔ یہ اصل قناعت ہے (12)۔

اقتصادی عدم مساوات نے سماجی سیاسی حالات کو بہت گھمبیر بنادیا تھا۔ مزدک انصاف و مساوات کو بروئے کار لانا چاہتا تھا۔ اس کی نظر میں مادی نعمتیں ''اھورا مزدا''، یعنی یزداں نے مساوی استفادے کے لئے پیدا کی ہیں لیکن انسانوں نے خودغرضانہ، غاصبانہ اور ظالمانہ، روش اختیار کرکے دنیا سے مساوات کو ختم کردیا۔ یہ اہرمن کی کارستانی تھی۔ اس کے شر میں آکر ہر شخص نے کوشش کی کہ دوسرے کا حصہ چھین کر اپنی خواہشات پوری کرے۔

مزدک کی تعلیمات کے دو اہم عناصر تھے:

ایک مذہبی مروجہ رسومات میں کمی کرنا۔ اس کے نزدیک سچا مذہبی شخص وہ ہے جو کائنات کے قوانین کو اچھی طرح سمجھے اور درست طور پر ان کی مطابقت میں چلے۔

دوسرا زرتشتی ملاؤں پر سخت ترین تنقید کرنا، جو کہ اس کی نظر میں عوام الناس کا استحصال کرتے تھے اور زیادہ غربت پیدا کرتے تھے۔

مزدک کا کہنا تھا کہ خدا نے بنیادی طور پر زمین پہ گزارہ کے ذرائع دے دیے تا کہ لوگ انہیں آپس میں مساوی طور پر تقسیم کریں۔ مگر زور آور نے کمزور پہ بالا دستی حاصل کی اور اس کا حصہ چھین کر نابرابری پیدا کی۔ اُس سے ''پانچ بلاؤں'' کو طاقت ملی جس سے انسان حق کی راہ سے گمراہ ہوا۔ یہ پانچ بلائیں تھیں: حسد، غصہ، انتقام، ضرورت، اور لالچ۔ ان برائیوں پر قابو پانے کے لیے انصاف کی بحالی ضروری تھی اور یہ ضروری تھا کہ ہر شخص اپنی زائد چیزیں اپنے دوسرے انسان بھائی کو بانٹے۔ اس کے لیے ساری دولت کو مشترک بنانا ضروری تھا۔ مزدک نے کہا مال و دولت عوام میں تقسیم ہونا چاہیے کیونکہ تمام انسان خدا نے پیدا کیے ہیں۔ پھر انسان حاجت مند کیوں ہوں؟۔ تمام انسانوں کو چاہیے کہ وہ ایک دوسرے کی کمائی ہوئی دولت سے استفادہ کریں تا کہ تنگدستی باقی نہ رہے اور تمام انسان مساوی الحال ہو جائیں۔ مزدک کے عقیدے کے مطابق دنیا میں جتنا دکھ ہے وہ اسی نابرابری کی وجہ سے ہے۔ اس کے لیے لوگ آپس میں لڑتے ہیں، جھوٹ بولتے ہیں، چوری کرتے ہیں، اور ایک دوسرے کا خون بہاتے ہیں۔ یہی عدم مساوات معاشرے میں دُشمنی، رشک وحسد اور جنگ پیدا کرنے کا سبب ہے۔ یہی وہ بلائیں ہیں جنہوں نے انسانی زندگی کو تباہ کر کے رکھ دیا ہے۔ اگر عدم مساوات دُنیا سے ختم ہو جائے تو یہ مصائب خود بخود نابود ہو جاتے ہیں اور ان کے بجائے صلح و صفائی، مہر ومحبت، رفاقت اور انصاف جنم لے سکتے ہیں۔

مزدک کی ہدایت تھی کہ قتل وخونریزی نہ کی جائے اور اپنے دشمنوں سے بھی نرمی برتی جائے۔(13)۔ مملکت کی ہر شئے کو، تمام لوگوں میں برابر تقسیم کر دینا چاہیے۔ مزدک بہت بڑا انسان تھا۔ وہ کہتا تھا کہ ''نابرابری مزید نابرابری کو پیدا کرتی ہے۔ حرص کی تکمیل آسودگی نہیں دیتی، بلکہ یہ مزید حرص کا لامتناہی سلسلہ بن جاتی ہے۔ یہ اہرمن کی رضا تھی، خدا کی نہیں جو محبت امن اور حسن ہے، جو نور ہے۔ خدا نے کسی کو دوسروں کے مقابلے میں زیادہ حصہ لینے کا حق نہیں دیا.......... یہ عین زرتشت کا فرمان تھا۔

مزدک کی نظر میں لالچ، خود غرضی اور حرص ہی ساری برائیوں کو پیدا کرتے ہیں۔ اسی حرص اور استحصال نے ''انسانیت کی برابری'' والے خدائی حکم اور خواہش کو تباہ کر دیا تھا۔ مزدک نے خدا کی اس خواہش اور حکم کی دوبارہ بحالی کو اپنا مقصدِ حیات بنا دیا(14)۔

''مال و دولت کو اس طرح مشترک بنانا چاہیے جس طرح کہ پانی اور آگ اور چرا گاہیں ہیں۔ ایسا کرنا نیکی ہے جس کا خدا نے حکم دیا ہے اور اس کا وہ نہایت عمدہ اجر دے گا۔ جب کسی قسم کی قیود نہ رہیں گی تو لوگوں کی باہمی امداد، خدائے پاک کے نزدیک مقبول اور پسندیدہ ہوگی''(15)۔ سارے یوٹوپیائی کمیونسٹوں کی طرح، مزدک کے خیال میں بھی کمیونسٹی مساوات کی بنیادوں پر ہی زرتشتی عقیدے کی شاندار عمارت کو اٹھایا جا سکتا ہے۔ ایک طرف، وہ نیک اور زاہد زندگی گزارتا تھا۔ دوسری طرف عوام الناس کی حالت اس قدر خستہ اور پست تھی کہ مزدک کا فلسفہ آناً فاناً مقبول ہوا۔ قحط کے زمانے میں گندم کے حصول میں مزدوروں کے غول اس کے ساتھ ساتھ پھرنے لگے۔ تب اُس کا نام مزدک پڑا، وہ نام جو سارے مملکتِ ساسانیہ میں پہچانا جانے والا تھا۔

کہتے ہیں کہ مزدک نے اپنی تعلیمات پر مشتمل ایک کتاب بہ نام ''زند'' لکھی۔ اس کتاب کے پیروکاروں کو ''زندیک'' کہا جاتا تھا۔

اُس کے فلسفے میں طبقاتی برابری کے علاوہ بھی بہت کچھ موجود تھا۔ مزدک کا ماننا تھا کہ ابتدا میں کائنات کے دو اصول تھے: روشنی یعنی اچھائی، اور تاریکی یعنی برائی۔ یہ دونوں ایک کائناتی حادثے کے نتیجے میں خلط ملط ہو گئے اور سوائے خدا کے' ہر چیز اندھیری ہو گئی۔ روشنی سے مراد آزاد ارادے کے ساتھ علم اور احساس ہے۔ جبکہ تاریکی جہالت اور اندھا پن ہے۔ انسان کو، زندگی میں اچھے برتاؤ کے ساتھ روشنی سے وابستہ کام کرنے کے لئے بنایا گیا۔ انسان کو اپنے عمل میں دنیا کے اندر روشنی پھیلانے کی جدوجہد کرنی چاہیے اور یہ کام بہتر اخلاقی رویوں اور مثالی زندگی سے کیا جا سکتا ہے۔ اُس کے نظریے میں نور آگاہ، اور ظلمت اندھا ہے۔ نور کا ظلمت پر غلبہ ضروری اور قطعی ہے۔

مزدک کے فلسفے میں قتل منع ہے۔ گوشت منع ہے۔ اُس کے نظریہ میں آدمی کو نرم خو ہونا چاہیے، مہربان اور مہمان نواز ہونا چاہیے۔ اُس نے نفس کشی پر بہت زور دیا۔ اس کا خیال تھا کہ نفسانی

خواہشات حرص کو جنم دیتی ہیں جو دوسروں کے استحصال تک لے جاتی ہیں۔ چنانچہ اِس انقلابی نے ایک سے زیادہ شادیوں پر ممانعت کردی (16)۔

وہ زرتشتی ملاّؤں کی مضبوط پوزیشن پر تنقید کرتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ملاّؤں نے عوام کو محکوم بنا رکھا ہے اور اُن کی غربت بڑھا دی ہے۔ مزدک کے مطابق خدا نے زمین پر گزر بسر کا کافی سامان مہیا کیا مگر طاقتور لوگوں نے کمزوروں کو ورغلایا پُھسلایا، اُن پر بالا دستی حاصل کی اور عدم مساوات پیدا کی۔ اس بدبختی کا علاج انصاف کی بحالی ہے اور ہر شخص ضرورت سے زیادہ ذخیروں میں، مساوی حقدار ہے۔ اس مقصد کے لئے وہ ساری دولت کو مشترک بنانا چاہتا تھا۔ مزدک نے برادرانہ امدادِ باہمی کی حوصلہ افزائی کی اور حرص وظلم کو کم کرنے کے لئے جائیداد کو اجتماعی ملکیت میں دینے کا تصور پیش کیا (17)۔

مزدک اور اس کے معتقدین کو جائز طور پر انسان کی تاریخ کے پہلے اصل سوشلسٹ قرار دیا جاتا ہے جو کہ سب کی بھلائی کی خاطر جائیداد اور محنت کو ساری کمیونٹی میں مشترک قرار دیتے تھے۔

اور یوں، چند ماہ کے اندر ہزاروں لاکھوں لوگ مزدکی بن گئے۔ سلطنت کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک مزدکیت ہی مزدکیت تھی۔

اصلاح کے اپنے عزم کے ساتھ وہ بہت سنجیدہ تھا، اُسے جلد ہی بہت سارے سنجیدہ حامی ملے۔ وہ خود کو ''زندیک'' کہلانے لگے۔ یعنی ''زند'' کے سچے ماننے والے۔ انہوں نے ان مفید آزادیوں سے استفادہ کیا۔ (18)

مگر، وہ انقلاب تو چاہتا تھا، وہ دنیا کے ہر دکھ کی جڑ اس نابرابری میں دیکھتا تھا، مگر یہاں احتیاط کی ضرورت بھی حد سے زیادہ تھی۔ وہ مانی کے خوفناک انجام سے واقف تھا۔ اُسے امراء، اور موبدوں کی طاقت کا علم تھا۔

پس ماندہ سماجوں میں عمومی طور پر، اور ماقبل صنعتی معاشرہ میں بالخصوص اچھے، شریف اور مہذب و خیرخواہ انسانوں کو فوری طور پر عقیدت مندی کا پوشاک پہنا دیا جاتا ہے۔ چنانچہ یہاں بھی علاقے کے مزدور اور کسان مزداد کی پرستش کرنے لگے تھے۔ وہ اس کے سامنے سربسجود نہیں ہوسکتے تھے کیونکہ مزداد انہیں سختی سے ڈانٹ دیتا تھا۔ ''میں تمہارے جیسا انسان ہوں''۔ لیکن وہ لوگ جو کچھ محسوس کرتے تھے اُسے محبت کہنا انہیں نہیں آتا تھا۔ غالباً فردوسی نے شاہنامہ میں اسی تحریک کی مقبولیت کی طرف اشارہ کیا۔

ہمی گشت درویش بااو یکی

اگر پیر بودو اگر کود کی!

وہاں ایک اور اہم معروض یہ بن گیا تھا کہ زرتشتی ملاّؤں اور وڈیروں کی طاقت بہت بڑھ چکی تھی اور بادشاہ اُن کے ہاتھوں یرغمال بن چکا تھا۔ اُس کی بادشاہی میں ملاّ ایک مسلسل دخل در معقولات بن چکے تھے۔ بادشاہ اُن سے عاجز آ چکا تھا۔ وہ اُن کی اس طاقت کو کمزور کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے وہ کسی ایسی قوت کے انتظار میں تھا جو عوام میں مقبولیت رکھتی ہو۔ اب جب کہ مزدک ایک عوامی روحانی اور انقلابی کے طور پر مقبول ترین شخصیت بن چکا تھا اور اُس کا نظریہ اب عوام الناس کا نجات دہندہ نظریہ بن چکا تھا تو شاہ قباد اول، (488۔۔۔۔531) نے اس نئے نظریے کی حمایت کی اور مزدکیت میں شامل ہو گیا۔ بادشاہ کی پشت پناہی میں مزدک نے سماجی معاشی اصلاح کے پروگرام جاری رکھے جن میں امن پسندی، اور غریبوں کی مدد کے لئے امدادی پروگرام شامل تھے۔ مزدک نے مزدوروں کی مدد کیلئے سرکاری سٹور کھول دیے۔

قباد نے جب مزدک کی تعلیمات کو مان لیا تو وہ قحط زدہ بدحال کسانوں سے یوں مخاطب ہوا ''میں آپ کا بھائی ہوں جب کہ آپ بھوکے ہیں تو آب و دانہ میرے لیے زہر کی مانند ہے۔ میں، مملکت ایرانیان کا شہنشاہ جو اس سرزمین کے ذرے ذرے پر مکمل اختیار وقوت رکھتا ہے، آپ کو اجازت دیتا ہوں کہ آپ امرا کے گوداموں سے، ابھی اور اِسی وقت اپنے اور اپنے معصوم بچوں کے لیے خوراک لے لیں'' (19)۔

مزدک کے اس بظاہر وفادار شاگرد اور حامی، بادشاہ قباد نے ایک فرمان جاری کیا جس میں اُس نے سارے پارس کے باشندوں کو مزدک کے عقیدے کو تسلیم کرنے کا حکم دیا، اور اُسی کے فرمودات کے مطابق زندگیاں گزارنے کا حکم دیا۔ نچلے طبقات سب سے زیادہ گہرے زندیک تھے

۔ بالخصوص عورتوں میں یہ مذہب بہت مقبول ہوا۔

چنانچہ مزدکیوں نے سماجی برائیوں کے خلاف کھلے عام جدوجہد کرنے کا اعلان کیا۔ ان کا مطالبہ تھا کہ فاضل جائیداد رئیسوں سے چھین لی جائے۔ اب شاہی حکم موجود تھا۔ چنانچہ وہ فوراً امیروں کی جائیدادوں پر قابض ہوئے............(20)۔

ظلم وجور کا ارتکاز تو انقلاب کا لاوا اگل دیتا ہے۔ اِس انقلاب کی قیادت مزدک کر رہا تھا۔ مزدک کے پیروکاروں نے امراء کے محلات پر حملے کر دیئے اور وہ ساری قیمتی چیزیں لے گئے جن پر انہیں مساوی حقدار ہونے کا یقین تھا۔

یہ تحریک بالکل مسیحیت کی ابتدا جیسی تھی۔ جبھی تو یہ دونوں تحریکیں دولت کی منصفانہ تقسیم چاہتی تھیں، ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے سے منع کرتی تھیں اور اشرافیہ وفیوڈل ازم کے خاتمے کی بات کرتی تھیں۔

یروشلم کے مسیح نے بھی تو یہی پیغام دیا تھا کہ ''خدا کاروبار نہیں کرتا۔ آسمانی بادشاہت میں کوئی شخص منتخب شدہ نہیں ہوگا نہ کوئی ایسا انتخاب ہوگا۔ خدا تمام مخلوق سے یکساں محبت کرتا ہے، جیسے سورج اپنی عنایات کو خاص لوگوں تک محدود نہیں رکھتا۔ تمام انسان آپس میں بھائی ہیں''(21)۔

''یسوع مسیح نے اپنے حواریوں سے یہی تو کہا تھا۔ 'یہ جو امیر لوگ ہیں ان کا خدا کی بادشاہت میں داخلہ بہت مشکل ہے'۔ حواری اس بات پر حیران ہوئے۔ یسوع مسیح دوبارہ گویا ہوا: 'بچو، جو لوگ مال وزر پر بھروسہ کرتے ہیں وہ خدا کی بادشاہت میں بمشکل داخل ہو پائیں گے۔ ایک امیر آدمی کے خدا کی بادشاہت میں داخلے کی بہ نسبت' ایک اونٹ کا سوئی کے ناکے میں سے گزرنا آسان ہے''۔

چنانچہ، جس طرح یسوع مسیح نے یہودیت کی اصلاح کردہ صورت پیش کی، بالکل اُسی طرح مزدک نے اپنے فلسفہ کو زرتشتی مذہب کی اصلاح کردہ اور پاک کردہ صورت قرار دیا۔

ظاہر ہے کہ ان تمام اقدامات سے وڈیرے یعنی وزرگان اور زرتشتی پیشوا یعنی موبدان، قباد بادشاہ کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ قباد جو کہ ''زندیک'' بن چکا تھا، گوشت نہیں کھاتا تھا، اور خونریزی کو جائز نہیں سمجھتا تھا۔ مگر قباد صورتحال کو غلط سمجھا تھا۔ موبد اور وزرگان کی قوت مزدک کی قوت سے بہت بڑی تھی۔ یوں ملاّ وڈیرہ اتحاد نے ردِانقلاب میں (496 میں) شاہ قباد کا تختہ الٹ کر اُسے زنداں میں مقید کر دیا اور وقتی طور پر قباد کے بھائی گاماسپ کو تخت پر بٹھا دیا۔ قباد نظر بند ہوا۔ مگر اس کا بیٹا خسرو جو بعد میں انوشیرواں کہلایا اور اس کا اتالیق ''برزچہر'' مزدک کے سخت مخالف تھے۔ ان لوگوں کی مدد سے قباد زنداں سے فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا اور حیاطلہ کے بادشاہ'' خاقان'' خوشنواز کے یہاں پناہ لی۔ خوشنواز نے اپنی بیٹی سے قباد کی شادی کی اور فوجی معاونت کے طور پر ایک لشکرِ جرار قباد کے سُپرد کیا تاکہ وہ اپنے بھائی گاماسپ کو ایران کے تخت سے اُتار سکے۔

قباد ہپتلائٹس کی مدد سے 498/499 میں جیل سے بھاگنے اور دوبارہ اقتدار سنبھالنے میں کامیاب ہوا۔(22)

چنانچہ قباد' حیاطلہ کی فوجی اعانت کے بل بوتے پر گاماسپ کو تخت سے اُتارنے میں کامیاب ہوگیا اور اس طرح دوبارہ ایران کا بادشاہ بن بیٹھا۔

اب تو قباد کی سمجھ میں اصل صورتحال آ گئی۔ اُسے اندازہ ہوا کہ موبدان بہت طاقتور ہیں۔ اُن کی مخالفت مول لے کر بادشاہی نہیں کی جاسکتی۔ اُس نے مزدک کی قوت کو بہت بڑھا چڑھا کر دیکھا تھا۔ اِسی لیے تو مذہب بدل دیا تھا۔ مگر اب جب اُسے طاقت کے اصل توازن کا اندازہ ہوا تو اس نے پھر پرانا مذہب اختیار کیا۔ بادشاہی کے وارے میں مزدکیت نہ تھی۔ حریت اور مساوات ہوں تو بادشاہی تو ختم ہو جاتی ہے۔ لہذا مساوات گئی بھاڑ میں، بادشاہت زندہ باد۔ قباد کو معبدوں ملاؤں کا زور کم کرنا تھا، اس کا وہ مقصد پورا ہوگیا تو مزدک کی اب ضرورت نہ رہی تھی۔

اس مرتبہ قباد کی سیاست بدل چکی۔ اُس نے مزدک اور مزدکیوں سے پہلے کی طرح سلوک روا نہیں رکھا بلکہ سردمہری سے پیش آنے لگا۔ مزدکیوں کے اثر ونفوذ میں کوئی کمی نہیں آئی بلکہ بادشاہی دربار میں ان کا تسلط برابر بڑھتا رہا۔ قباد کو یقین ہوگیا کہ مزدک اپنے انقلابی پیروکاروں کی وساطت سے ساسانی بادشاہت کا تختہ اُلٹنا چاہتا ہے۔ اب وہ سمجھ چکا تھا کہ مزدکیت ایک ایسا

انقلاب ہے جس نے درمیان میں کہیں بھی رکنا نہیں ہے اور جو اس کی بادشاہت کے خاتمے پر جا کر دم لے گا۔ چنانچہ اس نے مزدک کو ایرانی شہنشاہیت کا زبردست دشمن قرار دیا۔ اب کے اس نے زندیکوں (مزدکیوں) ہی کا قتل عام شروع کیا۔ یہودی بھی اس مزدک مخالف جنگ میں پیش پیش تھے۔ بہانہ وہی عورتوں والا تقدس تھا۔ عورت اور غیرت تاریخ میں ''سٹیٹس کو'' کے سب سے بڑے ذریعے رہے ہیں۔ یہ تو اچھا تھا کہ مزدک خود مذہبی پیشوا تھا ورنہ یہ قتل وغارت خدا کے نام پر کی جاتی۔ تصور کیا جاسکتا ہے کہ حتیٰ کہ ''بدھ'' کے نام پہ لاکھوں قتل ہو چکے ہیں۔ یہودی کے ہاں تو ویسے بھی عورتیں سماج کے لیے خطرہ ہیں اس لیے زنانہ خوش سلیقیت کی ساری نمائشیں دبادی گئیں۔ لہٰذا یہودی اور موبد نے ایک بار پھر بھاری سودخوری کی ،معصوموں کو قتل کر دیا اور شیطانوں سے سمجھوتہ کیا(23)۔ اس قتل عام کی قیادت کباد کے ولی عہد شہزادہ خسرو اول نے کی جسے پھر، انوشیروان (انوشک۔روبان ''لافانی روح والا'') کا خطاب ملا۔

قباد بیمار ہوا، تو اس نے انوشیروان کو ولی عہد بنایا۔ قباد، کل ملا کر 41 برس کی بادشاہت کرنے کے بعد فوت ہو گیا۔ انوشیروان بادشاہ بن گیا۔ مزدکیوں کی بدبختی آ گئی، بلوچوں کی بدبختی آ گئی۔

اس نے اِن مخالفین کا قتلِ عام شروع کر دیا۔ مزدکیوں کے قتلِ عام' کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ خسرو انوشیرواں کے حکم سے مزدکی فرقے کے چھوٹے بڑے افراد ایک ہی دن تہ تیغ کر دیئے گئے جس کی تفصیل ''شاہنامہ فردوسی' نے اس انداز سے بیان کی ہے:

بدان راہ بدنامور سہ ہزار

بفرزند گفت آن زمان شہریار

ترجمہ:۔

مزدک کے نامی گرامی پیروکار تین ہزار تھے

جس پر بادشاہ نے اپنے بیٹے سے کہا

کہ با ایں سران ہر چہ خواہی بکن

وزیں پس ز''مزدک'' مگردان سخن

ترجمہ:۔

ان سرداروں سے جو سلوک کر سکتا ہے کر گزر

اور اس کے بعد پھر کبھی ''مزدک'' کا ذکر نہ آنے پائے فردوسی لکھتا ہے:

بدرگاہ کسری یکے باغ بود

کہ دیوار او برتراز راغ بود

ترجمہ:۔

بادشاہ کے محل میں ایک باغ تھا

جس کی دیوار بہت اُونچی تھی

کہتے ہیں کہ انوشیروان نے اب اپنے ہی مخالف وڈیروں اور ملاؤں کی قیادت کرتے ہوئے جھوٹ موٹ میں مزدکیت کا مذہب قبول کر لیا۔ اس نے ایک جشن منعقد کرنے کی تاریخ مقرر کر دی جس میں کہ اس نے علی الاعلان طور پر باقاعدہ مزدکیت قبول کرنا تھی۔ اس نے شاہی باغ میں یہ جشن منعقد کرنے کا فیصلہ کیا اور اُس کے دعوت نامے مزدکیوں کو جاری کئے۔

ہمہ گرد برگرد آں کندہ کرد

مرایں مردمان را پراکندہ کرد

ترجمہ:۔

بادشاہ کے حکم سے اندرونی حصے میں گڑھے کھود دیئے گئے

تا کہ ان گڑھوں میں تمام لوگوں کو دفن کر دیا جائے۔

مقررہ دن پر جب مزدکیوں کا ہر گروپ باغ میں داخل ہوتا تو پہلے سے چھپے ہوئے فوجی انہیں پکڑ لیتے' تہہ تیغ کر ڈالتے اور انہیں سر کے بل زمین پر اس طرح گاڑ دیتے کہ اُن کی ٹانگیں زمین کے اوپر ہوا میں ایک درخت کی طرح نظر آتیں۔

بکشتند شان ہم بسان درخت

زبَر پائی دو سرزیر آ کندہ سخت

ترجمہ:۔

ان گڑھوں میں مزدکیوں کو درختوں کی طرح اس طرح گاڑا گیا کہ
ان کے پاؤں اوپر کی طرف تھے اور سر، زمین میں دھنسا دیئے گئے تھے۔

اب ہم مزید اِس شخص کی کیا تعریف کریں؟۔اُس کا جسے جاہل تاریخ ''نوشیروان عادل'' کہتی ہے۔اب ''مزدک'' کے اپنے قتل کا منظر فردوسی کے بیان میں ملاحظہ فرمائیے۔

یکی دار فرمود کسری بلند
فرو ہشت از دار پیچان کمند

ترجمہ:۔

بادشاہ کے حکم سے ایک بلند دار نصب کی گئی
جس پر ایک پیچدار رسا لٹکایا گیا تھا (پھانسی کی شکل کا)

جب سب قتل کر دیئے گئے تو پھر خون آشام انوشیروان نے مزدک کو دعوت دی۔

خسرو نے پھر مزدک کو باغ کا معائنہ کرنے کی دعوت دی:

''آپ وہاں ایسے درخت دیکھیں گے جو آج تک کسی نے نہیں دیکھے اور کسی نے اُن کے بارے میں حتیٰ کہ قدیم sages کے منہ سے بھی نہیں سنا۔(24)

اس نے خود گیٹ پر مزدک کا استقبال کیا اور اس سے باغ کی سیر کرنے اور درختوں کا معائنہ کرنے کی درخواست کی۔اندر جا کر انوشیروان نے الٹی کھڑی کی ہوئی لاشوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے چیخ کر مزدک سے کہا: ''رک جاؤ! یہ ہے وہ فصل جو تم نے اپنے شیطانی نظریے سے کاشت کی تھی''۔

نگوں بخت را زندہ بردار کرد
سر مرد بے دین نگوں سار کرد

ترجمہ:۔

مزدک بدبخت کو زندہ دار پر لٹکا دیا گیا
اور اس طرح اس بے دین کو نگوں سار کیا گیا

دانشوروں کا کمالِ فن دیکھو۔دین والے کو ''بے دین'' بنا دیا اور ظالم و مستبد کو دین والا۔

اور فردوسی تو فیوڈل ازم کا سب سے بڑا اور دیرپا ٹی وی اینکر رہا ہے۔!!

پھر فردوسی طوسی ''مزدک'' کے انجام کے پیش نظر قارئین کو اس طرح تنبیہ کرتا ہے۔

تب اس نے اشارہ کیا اور فوجیوں نے مزدک کو قابو کر لیا۔اسے باندھا گیا اور باغ کے وسط میں اسی مقصد کے لئے خصوصی طور پر تیار کردہ بلند مقام پر زمین میں زندہ گاڑ دیا گیا اور بے شمار تیروں سے اسے چھلنی کر دیا۔یہ واقعہ 528 کے اواخر یا 529 کے اوائل میں پیش آیا۔

وزان پس بکشتش بہ باران تیر
تو گر باہُشی راہِ ''مزدک'' مہ گیر

ترجمہ۔

اس کے بعد تیروں کی بوچھاڑ سے اُسے ہلاک کیا گیا
پس اگر تو خردمند ہے تو ہرگز مزدک کی راہ اختیار نہ کر (25)۔

فردوسی صاحب !ایسی خرد کو خدا مارے۔مزدک کی راہ اختیار نہ کرنا گمراہی ہے۔
بادشاہت اور جاگیرداریت اور ملائیت کے خلاف نہ ہونا تو غیر انسانی ہے۔فردوسی تمہاری قدر اپنی جگہ مگر حق کا ساتھ اس لیے تو نہیں چھوڑا جا سکتا کہ فردوسی نے ایسا کہا ہے۔

فلاسفر اور مبارز مزدک کی موت کا منظر تاریخ کے منہ پر ایک دُھائی ہے۔استبداد کی اس طرح کی کوئی مثال دنیا میں موجود نہیں ہے۔

اور وہ جو دودھ سے نہلایا ہوا پاک وصاف ''انوشیروانِ بے عدل'' ہے ناں اُس کے بارے میں بس ڈی میلو کا یہ قصہ کافی ہے:

افریقی جنگلوں میں ایک انگریز سیاح کو مردم خور قبیلہ کے لوگوں نے پکڑ لیا۔اس موٹے تازے انگریز کو سردار کے کھانے کے لیے مخصوص کیا گیا۔جب وہ اُس کے سامنے پیش کیا گیا تو

انگریز حیران ہوگیا کہ وہ سردار تو آکسفورڈ میں اُس کا کلاس فیلو تھا۔اُس نے سردار سے کہا کہ تم اتنے پڑھے لکھے اور مہذب، آدم خوری کرتے ہو تم میں اور اِن جاہلوں میں کیا فرق رہ گیا ہے؟''۔

سردار نے جواب دیا کہ ''بہت فرق ہے۔ یہ لوگ کچا کچا آدمی کو کھا جاتے ہیں۔ جبکہ میں تمہیں باقاعدہ پکا کر کھانے کے میز پر چمچے کانٹے سے کھاؤں گا''۔

انوشیروان اپنی بے پناہ جلالت وقوّت سے مزدکی بلوچ کاشتکاروں اور مویشی بانوں پر ٹوٹ پڑا۔فردوسی نے بلوچوں پر لشکر کشی اور مکران پر تاخت کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔

زمین، کوہ تا کوہ لشکر گرفت
ہمہ مرز مکران سپہِ برگرفت
بیا ورد پیلاں جنگی دو ویست
تو گفتی کہ اندر جہاں جائے نیست
از آوازِ اسپان و جوش سپاہ
ہے ماہ برچرخ گم کردہ راہ
طلا یہ بیا مدز مکران بہ شاہ
کہ مکراں سیہ شدز گردِ سپاہ

مزدک اور مسیح کی زندگیوں اور فلسفوں میں ایک اور حیرت انگیز مماثلت پائی جاتی ہے ۔ حضرت یسوع مسیح کو بھی مزدک کی طرح، وقت کے سیاسی اقتدار کے ساتھ عدم دوستانہ رہنے کے باعث مارڈالا گیا تھا۔ایسے ہی ہوتا ہے۔ اقتدار'اپنے جوتے چاٹنے والوں کو قتل یا ٹارچر نہیں کرتا،انہیں انعام دیتا ہے۔

جیسا کہ معلوم ہے کہ غریبوں، محکوموں، بیماروں اور بوڑھوں کا ساتھ دینے والا یسوع مسیح جانوروں کے ایک اصطبل میں پیدا ہوا تھا۔مسیحیت کا بانی مگر خود مسیحی نہیں، یہودی تھا، پہلی صدی کا یہودی۔حضرت عیسیٰؑ سیاسی ریڈیکل تھا۔وہ یروشلم کے شمال کے خطے گیلیلی میں پست وپسماندہ گاؤں کے پچھڑے کسان طبقے سے تھا، جہاں اُس وقت تیز رفتار سماجی تبدیلی چل رہی تھی۔اس کا آبائی قصبہ Nazareth گیلیلی کے وسیع ترین شہر سیفورِس کے چند ہی میل کے فاصلے پر تھا جو کہ بادشاہ ہیروڈ کا سیاسی مرکز بھی تھا۔اسی لیے یسوع مسیح یہودیت کے اندر ہی دولت وکلچر کے بہت بڑے فرق کو آسانی سے دیکھ سکتا تھا۔اس کی تعلیمات اور اعمال غریب اور محکوم کے لیے اس کی غیر معمولی حساسیت کا پتہ دیتی ہیں۔

وہ ایامِ جوانی میں درا کھانڑ (ترکھان) کا انکسار والا کام کرتا رہا،غریب لوگوں میں گھرا رہتا تھا، بری شہرت کے لوگوں میں، بیماروں میں، ہر طرح سے دکھی اور غمزدہ لوگوں میں۔ جب اُس نے اپنی تین سالہ بشارتی زندگی کا آغاز کیا تو اپنے شاگرد بھی محنت کش طبقوں میں تلاش کیے جن کو آج کی زبان میں''بے مین'' کہا جاتا ہے۔ان میں کچھ مچھیرے اور کھیت مزدور اور محصول لینے والے تھے۔ اُس کا پیغام تھا کہ میں بوجھ سے دبے ہوئے بے کس لوگوں کو آرام دینے اور تھکے ماندے اور احساسِ گناہ کے شکار انسانوں کو محنت، خدمت اور نجات کی خوشخبری دینے اور پیار کی انجیل سنانے آیا ہوں۔

یسوع کی پیدائش کی پہلی بشارت غریب چرواہوں کو دی گئی تھی ، یسوع مسیح کی ولادت 25 دسمبر کو بتائی جاتی ہے جس کو مسیحی برادری کرسمس کے نام سے منسوب کرتی ہے۔اُس دن ہر شخص اپنی بساط کے مطابق اُس سے اپنی محبتوں کا اظہار کرتا ہے۔

حضرت عیسیٰؑ کے ماننے والوں کا عقیدہ ہے کہ اُس دن تاریخ کے افق پر انصاف کا سورج طلوع ہوا، جس نے ظلم کے اندھیروں کو پاش پاش کردیا اور غریبوں، بیواؤں، اپاہجوں اور معاشرے کے دھتکارے ہوئے انسانوں کو سہارا ملا۔

روایتیں، کلاسیکل باتیں بڑی مزیدار ہوتی ہیں۔کرسمس ٹری کے بارے میں ایک روایت ملتی ہے کہ جرمن قبیلہ کے لوگ جوگرج (گرند) کے دیوتا کی پوجا کرتے تھے،تھور کو خوش کرنے کے لئے بچوں کو قربان کردیتے تھے۔ولفرڈ نامی جرمن،اس فرسودہ رسم کے خلاف تھا۔ایک مرتبہ تاریک اور سرد رات کو، شاہ بلوط کے درخت کے نیچے ایک بچے کو قربان کرنے کی تیاریاں ہورہی تھیں کہ ولفرڈ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ، موسمی طوفانوں کا مقابلہ کرتے ہوئے شاہ بلوط کے درخت کے نیچے پہنچ گیا،

جہاں بوڑھا پروہت مضبوطی سے بندھے ہوئے بچے کے گلے پر چھری رکھ چکا تھا۔ ولفرڈ نے آگے بڑھ کر پروہت کے ہاتھ کو روک دیا، اور چھری چھین لی۔ اس اچانک جرات کے مظاہرے پر لوگ بہت حیران اور خوش ہوئے۔ ولفرڈ اور اس کے ساتھیوں نے تمام لوگوں سے گفتگو کی اور ان کو یسوع مسیح کی نوید دی جسے انہوں نے قبول کیا۔ ولفرڈ نے کلہاڑے کی مدد سے اس درخت کو کاٹنا چاہا تو اچانک آسمانی بجلی گری اور اس درخت کو ٹکڑے ٹکڑے کردیا۔ پھر اُس جگہ ایک سرسبز اور شاداب درخت اُگا، جس کو ایور گرین کہا جاتا ہے۔

یوں یسوع مسیح کے 732 سال کے بعد کرسمس ٹری کی روایت نے جنم لیا اور لوگ اس واقعہ کی یاد میں کرسمس ٹری سجانے لگے۔ یسوع مسیح صرف انسانی حقوق کا علمبردار ہی نہیں بلکہ امن و انصاف اور سلامتی کا علمبردار بھی تھا۔

یسوع نے ایک ریڈیکل مساوات کی صدا لگائی۔ اُس کے ہاں کلاس، رینکک اور جنڈر کو گُھل مل جانا تھا۔ اکٹھا کھانا یسوع کے طرزِ آپریشن میں مرکزی تھا، اور وہ ہر ایک کو اُسی دسترخوان پہ مدعو کرتا۔۔۔۔ مردوں عورتوں کو، غلاموں آزادوں کو، سماجی طور پر مراعات یافتوں اور سماجی طور پر دھتکارے ہوؤں کو، رسوم وعبادت کے اندر پاکوں کو اور ناپاکوں کو۔

اُس نے Ten commandments میں سے ایک کو توڑ دیا تھا جب اُس نے سوچا کہ ایسا کرنا سب سے اشرف انسانی کام ہے۔ وہ کام یہ تھا کہ وہ Sabbath کے دن بھی کام کرتا تھا یعنی لوگوں کو تندرست کرنے کا کام۔ اُسی نے تو کہا تھا Sabbath انسانوں کے لیے بنا ہے نہ کہ انسان Sabbath کے لیے‘‘(Mark 2:27)

یہودیوں کی عید کے موقع پر جب، اپنی زندگی کے اواخر کے قریب یسوع گیلیلی سے یروشلم پہنچا، تو دو باتیں اہم تھیں۔ ایک تو یہ کہ اس کی زنانہ معتقدین اس کے ساتھ آئیں اور اُس کا ساتھ چھوڑ کر فرار نہ ہوئیں۔ وہ اُس کو ٹارچر کرنے اور مصلوب ہونے تک اُس کے ساتھ رہیں، نہ بھاگیں اور نہ اس کے پیروکار رہونے سے تائب ہوئیں۔

دوئم یہ کہ وہ عبادت گاہ چلا گیا اور اس کے مالی، قربانوی، اور عبادت کے آداب وارکان کے آپریشنوں کو خوب الٹ پلٹ دیا۔ اس نے منی چینجرز کے میز الٹ دیے اور انہیں عبادت گاہ سے باہر بھگا دیا۔ اس نے قربانی کے جانور بیچنے والوں کے مسند بھی باہر پھینک دیے۔ ’’جون 2:15‘‘ کے مطابق وہ ایک کوڑے کو محض منی چینجرز اور فروخت کنندگان کو باہر بھگانے کے لیے استعمال نہیں کر رہا تھا بلکہ بھیڑوں اور بیلوں جیسے قربانی کے جانوروں کی بڑی تعداد کو بھی۔

حضرت عیسیٰؑ نے عبادت گاہ سے تاجر طبقہ کو نکال باہر کردیا۔ اس نے ایک زانی عورت کو سنگسار کرکے ہلاک کرنے کی سزا جیسی روایتی‘ قدیم اور ظالمانہ قوانین کو مسترد کردیا۔ اس نے ایک بیوہ کے ایک معمولی سکے کو امیروں اور مشہور لوگوں کی قیمتی عطیات سے زیادہ قدر دیا تھا۔ اس نے انسانوں کے بیچ مذہبی افتخار، معاشی اور اخلاقی برگزیدگی کو مسترد کردیا تھا۔ حضرت یسوع نے غریبوں، کمزوروں اور ضعیفوں کے لئے ایک غیر متنازعہ راستہ بنایا تھا: وقار کا راستہ۔ حضرت عیسیٰ ایک عام سے گدھے پر سوار ہو کر یروشلم میں داخل ہوا۔

لگتا ہے کہ اس کی گرفتاری اور اسے صلیب پر چڑھانے کی فوری وجہ یہی تھی، اس لیے کہ نہ تو یہودی اور نہ رومن حکام اِس مصروف مقدس اور تعطیل کے سیزن میں دارالحکومت کے عین مرکز کی زندگی میں اس طرح کی ڈرامائی بدنظمی برداشت کرسکتے تھے۔ وہ چند پیروکاروں کی جھرمٹ میں ملٹری ٹارچر میں بدنام ہوا، بے عزت ہوا۔

یسوع مسیح کو صلیب پہ میخیں گاڑ کر قتل کیا گیا۔ دشمن کے اِس عمل میں محبت نہ تھی، بے انتہا نفرت تھی۔ اس لیے کہ وہ تو سارا نظام بدلنا چاہتا تھا، اُسے اس نظام سے کوئی محبت نہ تھی۔ اُس محبت کے علم بردار کو پھانسی پر چڑھایا گیا۔ یسوع دھرتی کا ایک باوقار عظیم انسان تھا۔ کیا کمٹ منٹ تھی، کیا برداشت تھی، اور کیا قربانی تھی۔ وہ جدوجہد کا آدمی تھا، اصول کا اور نظریے کا۔ محبتیں اُسے، عزت اُسے!!۔

یہ البتہ الگ بات ہے کہ بعد میں ایسے فلاسفروں اور مصلحوں کو عقیدہ اور عقیدت میں لپیٹ کر کچھ کا کچھ بنادیا جاتا ہے۔ مثلاً حضرت مسیح جو کہ ایک بے زر و مال استاد تھا، وہ یہودا کے تپتے سورج میں پتلے ریتلے ملک میں پھرتا، گاہے بہ گاہے ملنے والی غذا کے نذرانوں سے پیٹ بھرتا۔

ظاہر ہے اُس کی اصل شکل وصورت عام ستم دیدہ انسانوں جیسی ہوتی تھی۔لیکن پادریوں اور بادشاہوں کی طرف سے اُسے ہمیشہ دوسرے روپ میں ظاہر کیا جاتا ہے، اصلی کے برعکس۔ہم اکثر دیکھتے ہیں کہ پادریوں اور بادشاہوں کے یسوع کی تصویر صاف ستھری ہے، اس کے سنورے بال ہیں، وہ تروتازہ لگتا ہے، جامہ بےداغ، سیدھا کھڑا ہوا شخص۔اور اسے قدرے بےحرکت دکھایا جاتا ہے گویا وہ ہوا پر اڑا جا رہا ہو۔ایسی تصویرکشی ہی تو بڑے انقلابی انسانوں کو متعدد لوگوں کے لئے غیر حقیقی اور ناقابل اعتماد بنا دیتی ہے۔اس طرح عام آدمی' اصل کہانی کو ان کی دینداری سے متعلق عامیانہ انداز میں بڑھا چڑھا کر بیان کیے گئے غیر معقول اور ستائشی اضافوں سے خلط ملط کر جاتا ہے(26)۔یوں بڑے انسانوں کی تعلیمات پیچھے چلی جاتی ہیں اور اُس کی ظاہری نورانیت، کرامتیں اور عبادتیں رہ جاتی ہیں۔

دنیا نے دیکھا کہ یروشلم کے حاکموں اور ملاّؤں کے گٹھ جوڑ میں حضرت یسوع کو سزائے موت دینے سے وہ تحریک ختم تو نہ ہوئی جس کا مقصد محکوم اور دربدر انسانوں کی نجات تھی۔یہ الگ بات ہے کہ امیروں نے اُسی دولت شکن چرچ ہی کو اپنے مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنایا۔چنانچہ چرچ ایک طرف تو اقتدار و دولت والوں کا محافظ بنا اور دوسری طرف مایوس کن حد تک پدرسری کا علمبردار ہو کر عورتوں کے بدترین استحصال کا باعث بنا۔یوں بانی کی تعلیمات میں سے انقلابی روح یکسر نکال دی گئی۔

مگر ہم اُس کی تعلیمات کو بُھلا کیوں بھلانے دیں؟۔آیئے Sermon on the mount سے کچھ پڑھ لیتے ہیں:

مبارک ہیں وہ جو راستی کے بھوکے اور پیاسے ہیں۔

مبارک ہیں وہ جو رحم دل ہیں

مبارک ہیں وہ جو راستی کے سبب سے ستائے گئے ہیں۔

۔۔۔لوگ چراغ روشن کر کے پیمانے کے نیچے نہیں بلکہ چراغدان پر رکھتے ہیں تا کہ اُن سب کو جو گھر میں ہیں روشنی پہنچائے۔

میں تم سے کہتا ہوں کہ اگر تمہاری راستی فقیہوں اور فریسیوں (ملاّؤں) کی راستی سے زیادہ نہ ہو تو تم آسمان کی بادشاہی میں ہرگز داخل نہ ہوئے۔

(میتھیو، باب 5 صفحہ نمبر 3)

اسی طرح انوشیرواں نے مزدک اور اس کے ساتھیوں کو قتل تو کر دیا مگر ظاہر ہے اتنے بڑے اور منصفانہ نظریے کو ختم تو نہیں کیا جا سکتا تھا۔چنانچہ جب نیا ضیاء الحق خصوصیات والا انوشیروان 531 میں خود بادشاہ بنا تو اس نے مزدکیوں کے قتل عام کا ایک اور دور چلایا۔اس نے ہر خاص و عام کو حکم دیا کہ کوہ و دشت میں ہر جگہ مزدکیوں کو گرفتار کریں۔پھر، اُس نے اُن سب کو جمع کیا اور ایک صبح سب کو قتل کر دیا۔کہتے ہیں کہ اس چنگیز کے ہاتھوں تیس ہزار مزدکی مارے گئے۔(اندھے دانشوروں نے قاتل کو عادل بنا ڈالا)۔

اُس نے بہ ظاہر تو مزدک کی تعلیمات کو مکمل طور پر تباہ کر دیا مگر یہ فلسفہ تو مزدک کی شہادت سے بعد بھی صدیوں تک جاری رہا۔بلاشبہ مزدک کی تحریک ہمارے خطے کی تاریخ میں سب سے بڑی طبقاتی تحریک تھی(27)۔

مزدک کی انقلابی تحریک 494 عیسوی سے شروع ہوئی اور 524 عیسوی یعنی مکمل تیس سال تک بھرپور انداز میں جاری رہی(28)۔یہ غلام داری سماج میں ابھری۔

مزدک بہت مختصر عرصہ زندہ رہا اور اس دَور کے سماج میں اشارات و کنایات اور ایمائیت کے ساتھ اپنے نظریات پیش کرتا رہا اور جب اپنی خواہش کے مطابق شاہانہ نظام اور طبقاتی جکڑ بندیوں کے خلاف کھڑا ہوا، اور غریبوں کی حمایت کی تو اُسے کیفر کردار تک پہنچا دیا گیا۔

چونکہ یہ بہت ہی سادہ دور تھا۔پیداواری قوتیں فرسودہ تھیں۔علم و ابلاغ کے ذرائع بہت کم ترقی یافتہ تھے۔اس لئے مزدک سے یہ توقع رکھنا درست نہیں کہ وہ اپنے نظریات کو بہت منظّم انداز میں مرتب کر کے پیش کرتا۔

مگر یہی مدہم سا نظریہ سپارٹیکس سے ہوتے ہوئے یسوع تک آیا تھا اور پھر ارتقا کرتے کرتے، اور بےشمار مزدکی خصوصیات اختیار کرتے کرتے بالآخر جدید اشتراکیت کی شکل اختیار کر

گیا۔

مزدکیت کا دور اسلام آنے سے بہت پہلے کا دور تھا۔ غالب خیال ہے کہ اسلام سے قبل بلوچوں کی اکثریت اسی انقلابی مسلک ''مزدکیت'' سے وابستہ تھی۔ اور یہی بات دُشمنی اور نفرت کی اُس گہرائی اور شدت کا باعث تھی جو انوشیروان کو بلوچوں سے تھی۔ آپ تصور کریں کہ مندرجہ ذیل فرمان جاری کرنا عام نفرت تو نہ تھی: (شاہنامہ)

چاہے کوئی چھوٹا بچہ ہو
یا پھر تلوار اٹھانے والا پہلوان مرد
(وہ) بڑا ہجوم ہوں یا تھوڑے سے
ایک بھی نہ بچنا چاہیے

تفصیل میں جائے بغیر یہ بتانا کافی ہے کہ حکم کی تعمیل ہوگئی۔ اور رپورٹ یوں پیش کی گئی:

از ایشاں فراوان واندک نماند
زن و مرد جنگی وہ کودک نما ند
سراسر بہ شمشیر بگذاشتند
ستم کردن و رنج برداشتند
بو دایمن ازرنج شاہِ جہان
بلوچے نماند آشکارو نہان

ترجمہ:

ان میں سے ہجوم اور اکا دکا کوئی باقی نہ بچا
عورتیں اور جنگ کے قابل مرد اور بچے باقی نہ بچے
سب کے سب کو تلوار کے حوالے کیا گیا
جہان کے شاہ کو رنج سے نجات ہوئی
ایک بھی بلوچ ظاہر یا خفیہ، باقی نہ بچا

نفرت و دشمنی کی اور بھی چھوٹی موٹی وجوہات ہوں گی مگر اس قدر راتاہ نفرت تو طبقاتی نفرت ہی ہوا کرتی ہے۔ ایک قوم نچلا طبقہ بن چکی تھی اور بادشاہی نظام سے ٹکرا گئی تھی۔

یہ مزدکیت' بالخصوص دارالحکومت سے باہر دور دراز کے علاقوں میں کسی نہ کسی شکل میں کئی صدیوں تک قائم رہی۔ مبہم مبہم، مدھم مدھم، مدھر مدھر............

مزدکی مسلک عربوں کی فتوحات کے بعد بھی بہت عرصہ بعد آٹھویں صدی تک زندہ رہا۔ ابن مقفا نے ''مزدک کی کتاب'' کا عربی ترجمہ کر لیا۔ سلجوقوں کے پارسی وزیر نظام الملک نے مزدکیت کے بارے میں اپنے ''شاہنامہ'' میں اپنے حکمرانوں کو اس کے خلاف خبردار رہنے کی تلقین کی (29)۔ سچ ہے کہ دنیا کے سارے عوام دشمن دانشور' نظام الملک کے روپ میں جابر' ظالم اور فیوڈل انوشیروانوں کے فکری باڈی گارڈ رہے ہیں۔

مزدک کے عقائد بعد میں زیادہ تر شیعہ فرقہ کے ریڈیکل رنگوں میں مکس ہوگئے۔ اس کے شامل ہونے کے بعد علاقے میں زور آور انقلابی مذہبی تحریکیں چلیں۔ نویں صدی میں انسانی مساوات کا ایک مذہبی فرقہ، khurramites بھی مزدکیت کے زیر اثر ابھرا۔ اُسی فرقے نے بابک خرم دین کی قیادت میں عباسی خلافت کے خلاف ایک انقلاب ابھارا اور تقریباً 20 برس تک خلیفہ کی فوجوں کے خلاف لڑ کر بڑے علاقے کا کامیاب دفاع کیا۔ حتیٰ کہ سولہویں صدی کے قزلباشوں پر بھی مزدکیت کا اثر تھا جنہوں نے فارس میں صفوی سلطنت کی مدد کی۔ ''مزدکی'' لگتا ہے کہ ماقبل ماڈرن فارسی اور عربی مصنفین کا معیاری تحقیر آمیز لیبل رہا جو وہ ہر بعد کی ایرانی تاریخ میں ہر ریڈیکل انسانی مساوات کی تحریک پہ لگاتے تھے۔

مزدکیوں کے قتلِ عام کے بعد اس تحریک نے بجائے کم ہونے کے زیادہ زور پکڑا۔ اور ایران پر عربوں کے تسلط کے دوران مختلف جماعتوں کے روپ میں اپنا کام کرتی رہی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ 583 عیسوی میں مزدکیت سے متاثر ہو کر خاقانِ ترکستان کے سپاہیوں نے خاقان کے لڑکے ہشام ابرزی کی سرکردگی میں خاقان کے خلاف ہلہ بول دیا اور بخارا پر قابض ہوگئے۔ روایات سے ظاہر

ہوتا ہے کہ اس شورش کی وجہ سے بخارا کے تاجر اور دوسرے ثروت مند یہاں سے فرغانہ کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔ شورشیوں کے سربراہ ابرزی نے وہاں کے مفلوک الحال عوام کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ خاقانِ ترک جو تاریخ میں ''اقرہ چورین'' کے نام سے مشہور ہے 586 عیسوی یعنی انقلابیوں کی حکومت کے تین سال بعد اس تحریک کے مرکز ''بے قندرہ'' کو دوبارہ اپنے تسلط میں لانے میں کامیاب ہو گیا اور اپنے بیٹے ابرزی کو گرفتار کر کے مع اس کے ساتھیوں کے تہ تیغ کر دیا۔(30)۔

ابرزی شورش کی طرح دوسرا ہنگامہ خوارزمی شہزادے خورزاد سے منسوب کیا گیا ہے۔ مورخ طبری کا بیان ہے کہ خورزاد برادر شاہ خوارزم نے آٹھویں صدی عیسوی میں مزدک کے انقلابی فلسفے سے متاثر ہو کر یلغار کر دی اور تمام دولت مندوں کی جائیداد کو غریبوں میں تقسیم کر دیا۔ ساتھ ہی اس دَور کے حرم سراؤں کو ختم کر کے انسانی تقاضوں کے مطابق شادی بیاہ کے قوانین مقرر کئے۔

انصاف و مساوات کے نظریات کبھی ختم نہیں ہوتے۔

کہتے ہیں کہ مسلمانوں میں سے مزدکی بہت عرصے تک پہلوی زبان کی اپنی خفیہ کتاب ''ز ند'' برقرار رکھے ہوئے تھے جس میں مزدک کی تعلیمات لکھے ہوئے تھے۔ خلافت عباسیہ کے دور تک یہ مذہب جاری و ساری رہا۔ نو مسلم عجمی اسلامی لباس میں وہی مزدکی عقائد کی اشاعت کر رہے تھے۔ ''زندیک'' کا لفظ زندہ رہا۔(31)

کتابیات

1- آ کسوردی، میخائل۔ ''ایران۔ ایمپائر آف دی مائنڈ''۔ پنگوئن بکس۔ 2007۔ صفحہ 6۔

2۔ فہمیدہ ریاض۔ قلعہ فراموشی۔ دنیازاد کراچی ۔36۔ صفحہ 122

3۔ امروہوی، خیال۔ مزدک۔ کلاسیک دی مال۔ لاہور۔ صفحہ 41

4۔ فہمیدہ ریاض۔ قلعہ فراموشی۔ دنیازاد کراچی ۔36۔ صفحہ 153

5- جمالزادہ، محمد علی۔ مقدمہ کتاب عقائد مزدک۔ صفحہ 14

6- آ کسوردی............صفحہ 52۔

7- آ کسوردی صفحہ 53 بحوالہ۔ Daryaee, forthcoming; wiese hofer 2006, p160

8۔ بحوالہ طلوع اسلام۔ نومبر 1954، صفحہ 42

9۔ امروہوی، خیال۔ مزدک۔ کلاسیک دی مال۔ لاہور۔ صفحہ 16

10۔ فہمیدہ ریاض۔ قلعہ فراموشی۔ دنیازاد کراچی ۔36۔ صفحہ 161

11- ہنرخ گریٹز۔ ہسٹری آف دی جیوز۔ جلد 3، 1956 ۔ The Jewish Publication society of America۔ صفحہ 1

12۔ فہمیدہ ریاض۔ قلعہ فراموشی۔ دنیازاد کراچی ۔36۔ صفحہ 129

13۔ امروہوی، خیال۔ مزدک۔ کلاسیک دی مال۔ لاہور۔ صفحہ 55

14- براؤن، ایڈورڈ، جی۔ ''اے لٹریری ہسٹری آف پرشیا جلد نمبر کیمبرج۔ 1929۔ صفحہ 170۔

15۔ فہمیدہ ریاض۔ قلعہ فراموشی۔ دنیازاد کراچی ۔36۔ صفحہ 155

16۔ Yarshater, Ehsan. The cambridge history of Iran , vol-2 P-999

17- Corne, Patricia ۔ and Kawad's Heresy ۔" Mazdak Revolt" ، in: Iran 29 (1991), P- 21-40.

18- ہنرخ گریٹز۔ ہسٹری آف دی جیوز۔ جلد 3، 1956 ۔ The Jewish Publication society of America۔ صفحہ 1

19۔ فہمیدہ ریاض۔ قلعہ فراموشی۔ دنیازاد کراچی ۔36۔ صفحہ 156

20- ہنرخ گریٹز۔ ہسٹری آف دی جیوز۔ جلد 3، 1956 ۔ The Jewish Publication society of America۔ صفحہ 1

21- ایچ جی ویلز۔ مختصر تاریخ عالم۔ 2001۔ تخلیقات لاہور۔ صفحہ نمبر 175

22- آ کس وردی۔صفحہ 625
23- ہنرخ گریٹز۔ہسٹری آف دی جیوز۔جلد 3،1956 ۔ The Jewish Publication society of America۔صفحہ 2
24- آ کس وردی۔صفحہ 63۔
25۔امروہوی،خیال۔مزدک۔کلاسیک دی مال۔لاہور۔صفحہ 19
26۔ایچ۔جی ویلز۔مختصر تاریخِ عالم۔صفحہ نمبر 174
27- براؤن،صفحہ 171۔
28۔امروہوی،خیال۔مزدک۔کلاسیک دی مال۔لاہور۔صفحہ 37
29- دی کنسائز انسائیکلوپیڈیا آف اسلام۔لندن۔1989،صفحہ 264
30۔امروہوی،خیال۔مزدک۔کلاسیک دی مال۔لاہور۔صفحہ 59
31۔بحوالہ طلوع اسلام۔نومبر 1954،صفحہ 45

ٹام پین (تھامس پین)

مزدك Vol-1

ٹام پین نے خود جتنا زیادہ لکھا تھا، اُس کے اپنے بارے میں بھی اتنا ہی زیادہ لکھا گیا ہے ۔ یہ شخص تھا تو برطانیہ کا رہنے والا مگر آزادی کی جنگ جا کر امریکہ والوں کی لڑا اور وہ بھی اپنے ہی ہم وطنوں کے خلاف ۔ برطانیہ خود بھی آزاد کب تھا، بادشاہی نظام والا ملک بھلا آزاد ہوتا ہے؟۔ ظلِ الٰہی ،عزت مآب اور جلالت مآب اگر ایک ہی شخص ہو جائے تو باقی عوام تو ان القابات کے الٹ ہوتے ہیں ۔ بادشاہی میں تو دو آدمیوں کی عیش ہوتی ہے :ایک ملاّ (یا پادری) اور دوسرا جاگیردار۔ باقی آبادی تو بس طبعی اور روحانی طور پر جولان پوش کارکنوں پر مشتمل ہوتی ہے جن کے کوئی حق حقوق نہیں ہوتے ۔ تھامس پین ایسے ہی غریب ماں باپ کے ہاں پیدا ہوا۔ ہم اٹھارویں صدی کی بات کر رہے ہیں۔

تھامس پین کی تعلیم کوئی خاص نہ تھی ۔ سادہ، سچا، خلوص سے بھرا عام سا لڑکا، گرتا پڑتا بڑا ہوتا بچہ۔ جس کی روحانی پاکیزگی لاثانی تھی ۔

ظاہر ہے کہ وہ کسی سکول میں نہ جا سکا، اس نے زیادہ کتابیں نہیں پڑھی تھیں ۔ لہٰذا اُس نے جب بھی لکھا الفاظ کی محتاجی میں نہ لکھا، عوام الناس کی زبان ہی اس کی تحریری زبان تھی ۔ ایک زبردست کام اُس کے ساتھ یہ ہوا کہ اُس نے ''سچ'' کی جانبداری شروع کر دی ۔ جہاں جہاں سچ ہوتا وہاں تھامس پین ہوتا ۔ اور جہاں سچ میں ملاوٹ نظر آئی تھامس وہاں سے اسپ تازی کی رفتار سے دور بھاگتا ۔ لہٰذا وہ دربار سے دور تھا، عدالت سے دور تھا، پادری کے چرچ سے دور تھا۔ اور آپ اِن جگہوں سے جتنا دور ہونگے عوام الناس سے اُسی قدر نزدیک ہونگے ۔ اور عوام تو اس کا اپنا طبقہ بھی تھا۔ آسانی سے گھل مل جانے والے عوام الناس سے تھامس پین کی وابستگی زندگی بھر رہی ۔

مگر اپنے ملک میں اُسے آزادی کی کوئی امید نظر نہ آئی ۔ لوگ چرچ اور بادشاہ کی دیکھی اَن دیکھی زنجیروں سے چمٹے ہوئے تھے ۔ خیر کی امید تو عوام سے تھی مگر عوام میں اُس وقت تک کوئی تحریک کوئی تنظیم نہ تھی ۔ 40,35 سال کا یہ شخص تو سچ کا متلاشی تھا۔ سچ کی حاکمیت چاہتا تھا۔ لہٰذا بے وارث، بے ملکیت اور بے روزگار پین برطانیہ چھوڑ کر امریکہ کے لئے روانہ ہو گیا۔ امریکہ نئی دنیا جو تھی ۔

تھامس وہاں پہنچا جو برطانیہ کی نو آبادی تھا۔ خود برطانیہ میں انصاف نہ تھا تو اُس کی نو آبادی میں انصاف کہاں سے آتا؟ ۔ بے پناہ ذہانت سے مزین تھامس پین نے غلام امریکہ کو برطانیہ سے آزاد کرنے کی ٹھان لی۔ غلامی سچ کو قفس میں جوڑالتی ہے ۔ اور سچ تو تھامس پین کا پیر خانہ تھا۔ اُس نے ''کامن سینس'' نامی کتابچہ لکھا۔ عام زبان میں، عام سے دلائل اور عام سے منطق بھرا کتابچہ۔ ''غلامی غیر انسانی ہوتی ہے اور آزادی اشرف حالت''۔ اس شخص کی اس تحریر نے عوام الناس کے دل و دماغ جھنجھوڑ کر رکھ دیئے۔ اس نے صرف غلامی کے خلاف نہ لکھا بلکہ اس نے بادشاہت کے خلاف بھی لکھا جس کا تلخ ذائقہ وہ برطانیہ میں چکھ چکا تھا۔ لہٰذا '' آزادی اور جمہوریت

'' کی بات اس پمفلٹ کی ہر سطر میں موجود تھی ۔ پمفلٹ ایسا مقبول ہوا کہ کہنے والے تو امریکہ کی آزادی میں اس کا حصہ بہت بڑا سمجھتے ہیں ۔ اور اس جتنا بڑا سیاسی لکھاری نہ ہوگا ۔ اُس میں کمال یہ ہے کہ وہ عام سی سیاسی بات اٹھاتا ہے ۔ اور پھر پردے اٹھاتا چلا جاتا ہے ۔ اور بالآخر سچ تک جا پہنچتا ہے ۔ اس سارے سفر میں وہ اپنے قاری کو سختی سے گرفت میں رکھتے ہوئے چلتا ہے ۔ عقل ، اور سچ ، تفکر اور آزادی ، جدوجہد اور قربانی ۔ ۔ ۔ ۔ کامن سینس ، آج بھی ہم تیسری دنیا کے محکوم عوام کے لئے نصابی درجہ رکھتا ہے ۔ کاش اس کا اردو ترجمہ ہوتا ۔

اب تو اُس کے مجموعہِ تصانیف پورے کا پورا ملتا ہے مگر '' کامن سینس '' تو ساری کتاب کی روح ہے ۔ آپ پڑھیں تو لگتا ہے اُس میں کوئی بات نئی نہیں ہے مگر غور کریں تو ہر بات نئی ہے ۔ ہر بات آپ کے دل میں اترتی جاتی ہے ۔ چھوٹے چھوٹے جملے ہیں ، سادہ سی زبان ہے ، کوئی سکول ماسٹروں والا لہجہ نہیں ہے ۔ مگر اثر اس قدر گہرا کہ جس نے کتاب پڑھی وہ آپے میں نہ رہا ۔ تحریک آزادی میں شامل ہوا اور امریکہ کو آزاد کرنے تک اس تحریک میں شامل رہا ۔

اُدھر اسی زمانے میں فرانس میں انقلابی ابھار کی آمد آمد نے تھامس پین کو اپنی جانب کھینچ لیا ۔ وہ وہیں چلا گیا جہاں اس کے پہنچنے سے قبل اس کی شہرت پہنچ چکی تھی ۔ اس نے ایک اور زبردست چیز لکھی : '' انسان کے حقوق '' ۔ یہ تصنیف ڈکٹیٹر شپ کے نقصانات پر مبنی تھی ۔ وہی چھوٹے چھوٹے فقرے ، وہی بے بناوٹی طرز اور وہی عام فہم باتیں ۔ میں نے جس بھی بڑے ادیب کو ٹام پین کا مجموعہِ تصنیف دیا ، اس نے تکلف میں 'میری خاطر اسے پڑھا ۔ جیسے اس پہ کوئی اثر ہوا ہی نہ ہو........... مگر کچھ عرصہ گزرنے کے بعد اُس تصنیف کی تعریفیں کرنے لگا ۔ اس شخص نے آمریت کے حق میں پوری تاریخ میں موجود دلیلوں کو ایک ایک کر کے اٹھایا اور بڑی تفصیل سے اپنے منطقی انداز میں لکھتے ہوئے ان سب کو باطل قرار دیا ۔ کاسماس کے مصنف کارل ساگاں سے دوسوسال پہلے ٹام پین نے کہا تھا کہ '' ساری دنیا میرا گھر ہے اور انسانوں کی بہتری کے لئے کام کرنا میرا مذہب ہے '' ۔

اور پھر سونے کی قدر تو سنار کے پاس ہوتی ہے ۔ فرانس والوں نے ایک نہیں ' دو نہیں ' بلکہ چار حلقوں سے اس غیر ملکی کو اپنی قومی اسمبلی کا ممبر بنایا ۔ اُس سے بھی بڑھ کر اس کی یہ عزت ہوئی کہ اسے فرانس کا آئین لکھنے کو کہا گیا ۔

مگر رکیے ! ۔ اب ہم ٹام پین کی بات کر رہے ہیں کسی ایرے غیرے کی نہیں ۔ تماشا ہو گیا ۔ انقلابیوں نے اسمبلی کے اندر بادشاہ سے انتقام کی صدائیں لگائیں ۔ مگر ٹام پین ماضی کو بھلا کر ایک نیا معاشرہ قائم کرنا چاہتا تھا ۔ ایک مساوات اور عدل بھرا معاشرہ ۔ اس نے مقبولِ عام اکثریت کے خلاف جانے کا فیصلہ کر لیا اور اس نے بادشاہ کو سزائے موت دینے کے خلاف ووٹ دیا ۔ ظاہر ہے اسے ہی گرفتار ہونا تھا اور سزائے موت سننی تھی ۔

'' پروطن '' ٹام پین قید میں پڑا موت کا انتظار کر رہا تھا ۔ بہر حال وہ سزائے موت سے بچ گیا ۔ اس نے ایک اور معرکتہ الآراء کتاب لکھی '' عہدِ عقل '' ۔ اب کے یہ کتاب کلیسیا کے خلاف تھی ۔ فرانس انقلاب تو لا چکا تھا مگر عقل پہ مذہب کی زنجیریں تا حال مضبوطی سے موجود تھیں ۔ چنانچہ فرانسیسی آبادی سراپا ملاّ بن گئی ۔ دلیل کے جواب میں دلیل نہ ملے تو لوگ بہت ہلکے پن پر اتر آتے ہیں ۔ سوشل بائیکاٹ کی حد تک یاروں نے اسے تنہا چھوڑ دیا ۔ ٹام پین 73 برس کی عمر میں فوت ہو گیا ۔

رابرٹ اوون

برطانیہ میں بھاپ اوراوزار بنانے کی مشینیں ہاتھوں سے چلنے والی پرانی دستکاری کا مذاق اڑاتی جارہی تھیں۔اور بڑی تیزی کے ساتھ برطانیہ کوجدیدصنعت میں ڈھال رہی تھیں۔وہاں صنعتی پیداوار کا طوفانی اور ہیجانی دورشروع ہورہا تھا۔(ہیجان توکیپٹل ازم کا پیدائشی ساتھی ہوتا ہے)۔سماج وسیع تجوریوں والے سرمایہ داروں اور خالی جیب وخالی ہاتھ مزدوروں کے بیچ بڑی تیزی سے تقسیم ہورہا تھا۔درمیانہ طبقہ اب مستحکم طبقے کے بجائے دستکاروں اور چھوٹے دکانداروں کی ایک غیر مستحکم بھیڑ میں بدل رہا تھا۔دیہات کی کھلی اور خودکفیل زندگانی پہ بے روزگاری جھاڑو پھیر رہی تھی۔اس لیے دیہات خالی ہوہوکر بھوتوں کے مسکن بنتے جارہے تھے۔یہی بے روزگاری دیہات کی اِس آباد ی کوشہروں کے بدترین کوارٹروں میں پٹخ رہی تھی۔روایتی دیہی اخلاقیات،اب رسم ورواج سے مکمل طور پر عاری صنعتی کچی آبادیوں کے سامنے دوزانو ہورہی تھی۔جنت سے جہنم...........گاؤں سے شہر ،زراعت سے صنعت،گزربسر کے مستحکم حالات سے روز بروز غیرمحفوظ ہوتی ہوئی روٹی روزگار کے حصول کے حالات۔...........انسان ایک قولنجی درد میں تلملا رہا تھا۔

افراتفری،نفسانفسی اور ہڑادھڑی کے اس بے ہنگم چوراہے پر رابرٹ اوون نامی ایک راہنما،مصلح اور پاک شخص نمودار ہوتا ہے۔وہ سینٹ سائمن سے دس برس چھوٹا تھا۔وہ ایک زِین ساز کا بیٹا تھا۔

اوون دکھوں کے خلاف خصوصاً حساس تھا۔اس نے ساری زندگی اُس ڈانسنگ سکول کو look back کرنا تھا جس میں اسے اس وقت بھیجا گیا تھا جب وہ ابھی بچہ تھا اور جہاں اس نے چھوٹی بچیوں کی disappointments دیکھی تھیں جو پارٹنرز لینے کے قابل نہ تھیں، Torment کے veritable مقام کےبطور۔

اس نے دس برس کی عمر میں گھر چھوڑ دیا اوراتنی تیزی سے بلندی تک پہنچا کہ بیس برس کی عمر میں اس نے خودکو مانچسٹر میں ایک کاٹن فیکٹری کا واحد مالک دیکھا۔جس میں اس کی ماتحتی میں 500 مزدور کام کرتے تھے۔وہ حیران ہوا کہ وہاں ''مردہ مشینوں پر بہت توجہ دی جاتی تھی اور زندہ

مشینری کونظر انداز اور disregard کیا جاتا تھا‘‘۔’’میں اُن حصہ داروں سے تھک چکا تھا جو سستا خریدنے اور مہنگا بیچنے کے تربیت یافتہ تھے۔ یہ پیشہ ہمارے عمدہ ترین nature کے عمدہ ترین اور بہترین faculties کو تباہ اور برباد کردیتا ہے۔ایک طویل زندگی کے تجربے سے، جس میں تجارت، مینوفیکچر اور کامرس کے سارے gradations سے گزرا، میں مکمل طور پر قائل ہوں کہ اس مکمل طور پر خودغرض نظام کے تحت کبھی بھی بلند کیریکٹر نہیں بن سکتا۔ سچ، دیانتداری، نیکی محض نام کے ہوں کہ جس طرح کہ آج ہیں اور ہمیشہ سے رہے۔اس نظام کے تحت سچی سولائزیشن بن ہی نہیں سکتی۔اس لیے کہ اس کے اندر لوگوں نے مخالف مفادات پیدا کر کے ایک دوسرے کی مخالفت اور ایک دوسرے کو تباہ کرنا سیکھ رکھا ہے۔ یہ سماج کے معاملات سے نیچ، بازاری، جاہلانہ اور ذلیل طرز کا نمٹنا ہے۔اور اس وقت تک کوئی مستقل، عمومی اور اچھی خاصی بہتری نہیں آسکتی جب تک کہ اس کی جگہ کیریکٹر سازی اور دولت پیدا کرنے کا ایک superior mode. نہ لے لے۔اس نے وہاں بے ترتیبی کو ترتیب دینے کی کامیاب کوشش کی بنیاد ڈالی۔اس فیکٹری کو اس نے برطانیہ بھر کے لیے ایک مثالی فیکٹری بنا ڈالا۔سال 1800 سے لے کر 1829 تک اس نے سکاٹ لینڈ کی ایک کاٹن فیکٹری میں حصہ دار بن کر اپنی فکر کا زیادہ آزادی اور کامیابی سے اطلاق کیا۔جب اوون نے سکاٹ لینڈ میں کاٹن فیکٹریوں کا قبضہ سنبھال لیا تو انہیں گندے اور شرابی اور حد درجہ بے اعتبار مردوں اور عورتوں کا ایک گروہ چلاتا تھا۔ یہ لوگ یتیم خانوں سے پانچ اور دس سال کے بچوں تک سے کام کرواتے تھے۔افتادگانِ خاک کے اِن لوگوں پہ اس نے چوتھائی صدی میں ایک ایسی کمیونٹی بنائی تھی جو اعلیٰ معیارِ زندگی سے مستفید ہوتی ہو، اور اچھی خاصی تعلیم یافتہ ہو۔وہ انہیں زیادہ اجرت دیا کرتا تھا اور کم گھنٹے کام کرواتا تھا۔وہ اپنے پارٹنروں کو ایک معین رقم دیتا تھا اور بقیہ رقم اُسی کمیونٹی کی بہتری میں لگاتا تھا۔(صفحہ 91)

وہ دراصل دنیا کو یہی دکھانا چاہتا تھا کہ معاشرہ کو اس طرح چلایا جاسکتا ہے۔ وہ اپنے مزدوروں کے بچوں کو ماں باپ سے کم سنی میں لے لیتا اور انہیں بغیر کسی سزا اور سختی سے تعلیم دلاتا۔وہ لوگوں کو کہتا کہ اس طرح مکمل طور پر ایک نیا انسان بنایا جاسکتا ہے(صفحہ 92) اس نے 2500 بدل اور مختلف النوع مزدوروں کو ایک ماڈل کالونی میں بدل دیا۔جہاں نشہ، پولیس، مجسٹریٹ، وکیل، اور خیرات کی کوئی گنجائش نہ تھی۔اس نے غیر انسانی رہائشی علاقے کی صورت بدل کر رکھ دی۔اس نے ان بستیوں میں سستی دکانیں کھول دیں۔بچوں کی تعلیم سماجی ذمہ داری بنادی اور ایک کمیون کا سا نظام اپنالیا۔

اسی دوران اس نے اپنے دو مضامین چھپوائے۔اس کا خیال تھا کہ ماحول انسان کا کردار بنالیتا ہے جس پر کہ اس کا کوئی کنٹرول نہیں ہوتا۔ چنانچہ اگر بچپن میں ہی بچے کو اچھا ماحول فراہم کیا جائے اور بعد میں انسانوں کی دوسرے انسانوں کے ساتھ غیر ذمہ داری کے رویے کو ذمہ داری میں بدل دیا جائے تو بہت بڑی تبدیلی آسکتی ہے۔اس نے بچوں کے ایسے سکول کھولے جہاں تین سال کی عمر میں انہیں والدین سے لیا جاتا اور ان سکولوں میں داخل کیا جاتا تھا اور ایسی زبردست سہولیات ملتی تھیں کہ بچوں کو اپنے والدین کے گھروں میں جانے کی خواہش تک نہ ہوتی تھی۔دوسرے صنعت کار اپنے مزدوروں سے تیرہ چودہ گھنٹے مشقت کراتے تھے مگر اُس کے ہاں اوقاتِ کار صرف دس گھنٹے ہوا کرتے تھے۔ پیداوار زبردست، منافع بے انتہا۔

اس کی شہرت آسمان تک پہنچ رہی تھی۔دولت، اعزازات، اور تالیاں، اس پر برس رہی تھی۔وہ یورپ سطح کا مقبول ترین شخص بن چکا تھا۔ایک معتبر ومقتدر مُصلح۔

مگر وہ پھر بھی مطمئن نہ تھا۔اُسے لگتا تھا جیسے وہ آقا ہو اور فیکٹری مزدور اُس کے رحم وکرم کے محتاج ہوں۔اُس نے اخذ کرلیا کہ اگر مزدور آزاد ہوجائے تو اس کی پیداوار بے انتہا بڑھ جاتی ہے۔اسے مزدور طبقہ ایک نئی دیوہیکل پیداواری قوت کی شکل میں نظر آیا جسے اب تک محض چند افراد کو امیر بناتے رہنے اور عوام الناس کو غلام بنانے پر لگا دیا گیا تھا۔رابرٹ اوون اس نئی قوت کو ساری انسانی آبادی کی بہبود پر لگا دینا چاہتا تھا۔اسی حساب کتاب سے ہی اُس نے اپنا کمیونزم کا نظریہ وضع کیا۔اس نے اپنے مزدوروں کی کالونیوں کے قیام پر خرچے کا تخمینہ لگایا، سالانہ اخراجات کا اندازہ لگایا اور متوقع آمدن کا حساب لگایا۔اس مفصل و باریک حساب کتاب سے اس نے ثابت کیا کہ بنی نوعِ انسان کو تمام بنیادی سہولتیں دی جاسکتی ہیں۔انسانیت کی توقیر اور محنت کی عزت کی جاسکتی ہے۔

مگر اس کو اندازہ ہوا کہ پارٹنر اس کے طریقوں کو پسند نہیں کرتے۔ وہ نئے شراکت دار ڈھونڈتا رہتا مگر کوئی ملتا ہی نہ تھا۔ اسے اس حقیقت کا سامنا کرنا پڑا کہ سرمایہ دار ایک لالچی اور تاریک ذہن وفکر کے لوگ ہوتے ہیں۔ اس کا اعتبار اُس وقت تو بالکل ٹوٹ گیا جب اس کی طرف سے لائی کردہ ایک بل پارلیمنٹ میں پیش ہوا جس میں چائلڈ لیبر کی مخالفت تھی۔ اُس کی کاٹن Spinners کی طرف سے نہ صرف سخت مخالفت کی گئی بلکہ اُن کے اصرار پہ ایسے سیاستدانوں کی طرف سے بل کو emasculate کیا گیا جن پہ اس کو بہت بھروسہ تھا (صفحہ 93)

مگر، اُسے اپنے منصوبے کو وسیع پیمانے پر لاگو کرنے میں تین بڑی رکاوٹیں نظر آئیں: نجی ملکیت، عقیدہ، اور شادی کی مروجہ شکل۔ اسے معلوم تھا کہ اگر اُس نے اِن تینوں پر حملہ کیا تو اسے مسیحی دنیا اور سماج سے خارج کر دیا جائے گا اور جو عزت ووقار اُسے حاصل ہے سب کچھ چھن جائے گا۔ مگر اُس نے کسی چیز کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اپنے نظریے کو عام کرنا شروع کیا۔ اس نے محنت کے اتحاد اور مشین کو انسان کے ماتحت کرنے کا نظریہ دیا۔ ایک طرح کا سوشلزم۔

اس نے بے روزگاروں کے لئے ''اتحاد وتعاون'' کے گاؤں قائم کرنے کی سفارش کی۔ جہاں ہزار سے پندرہ سو ایکڑ پر بارہ سو افراد رہیں گے۔ سارا گاؤں ایک گھر کی طرح ہو جہاں ایک پبلک باورچی خانہ ہو۔ ہر خاندان کا اپنا گھر ہو۔ تین سال سے زائد عمر کے بچوں کی پرورش ماں باپ نہیں بلکہ پوری کمیونٹی کرے۔ محنت مشترک ہو، کھیل کود اور تفریح کی سہولتیں سب کو حاصل ہو۔ زرعی کاشت اور جدید ترین مشینری سے لیس ان جیسی دس دس، سوسو اور ہزار ہزار آبادیوں کے یونٹ بنا دیئے جائیں اور پوری دنیا کو ایسی بستیوں میں ڈھال کر تمام سہولتوں سے آراستہ کیا جائے۔

اس نے اس مقصد کے لئے ایک مذہبی فرقے سے 30 ہزار ایکڑ زمین خریدی، اُسے (نئی ہم آہنگی) New Harmoney کا نام دیا اور وہاں اپنی سوچ کی مطابقت میں نظم وضبط قائم کیا۔ مگر اس مذہبی گروہ کے ساتھ اس کے اختلافات پیدا ہو گئے۔ تین سال بعد وہ وہاں سے علیحدہ ہوا۔ اسے زبردست نقصان ہوا۔

وہ 1833 تک ایسے تجربات کرتا رہا۔ وہی ہوا جس کا اُسے خدشہ تھا۔ وہ سماجی مرتبہ سے گرادیا گیا، اخبارات اُس کا نام تک نہ چھاپتے تھے، اور ناکامیاں اس کا مقدر بن گئیں۔

مگر اس نے ہمت نہ ہاری۔ مزدوروں کو منظم کر کے اس نے اپنی جدوجہد جاری رکھی اور پانچ سال بعد 1819 میں فیکٹریوں کے اندر عورتوں اور بچوں کے اوقاتِ کار کو ایک جگہ متعین کروانے کا قانون منظور کروایا۔ اس نے سارے برطانیہ کے مزدوروں کو ایک بڑی ٹریڈ یونین میں منظم کر کے اس کی پہلی کانگریس کی صدارت کی۔ کواپریٹو سوسائٹیاں بنا کر اس نے ثابت کر دیا کہ تاجر اور صنعت کار سماجی طور پر بالکل غیر ضروری ہیں۔ اس نے محنت کے بازار متعارف کرائے جہاں محنت کی پیداوار کا تبادلہ ہوتا تھا۔ اس نے ''محنت کا نوٹ'' متعارف کرایا جس کی مالیت ایک گھنٹہ محنت کی ہوتی تھی۔

1834 میں رابرٹ اوون کی قیادت میں یہ ٹریڈ یونین تحریک زبردست انداز میں ابھری تھی۔ اس مقبولِ عام مزدور تحریک میں اخلاقیات زیادہ تھی' اور وہ سائنسی کم تھی۔ لیکن وہ ٹریڈ یونین کو صرف اجرت بڑھانے کی بجائے سماجی تبدیلی تک لے جانا چاہتا تھا۔ گو کہ وہ انقلاب کی طرف نہ جاتا تھا بلکہ کمیونزم کی بنیاد پر نئی آبادیاں بنا کر سرمایہ داروں کو کمیونزم کی اچھائیاں دکھا کر کمیونسٹ بنانا چاہتا تھا۔ اوون اور اس کے ساتھی لیڈروں کو اندازہ ہی نہ ہوا کہ اُن کی خیرخواہی کے باوجود چھ ماہ کے اندر اندر سرمایہ داروں نے اُن کی تحریک کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ ٹریڈ یونین سے وابستہ ہر مزدور کی چھانٹی ہوئی اور اوون صاحب حیران اور پریشان تکتے رہ گئے۔

ویسے بھی یہ تجربہ ایک آدھ فیکٹری میں تو کامیاب ہو سکتا تھا پورے برطانیہ میں نہیں۔ اس لئے کہ اس سب کیلئے تو ریاستی اقتدار چاہیے تھی، ادارے چاہیے تھے، پوری داخلہ خارجی پالیسی اپنے ہاتھ میں لینی ہوتی تھی............ اور اس سب کے لئے ایک واضح منشور کے ساتھ مزدوروں کی ایک مضبوط پارٹی کی ضرورت تھی۔ یہ سب کچھ اُس زمانے میں ممکن نہ تھا۔ کامیابی کا ملنا قبل از وقت تھا۔ ناکامی ہوئی۔ مگر سرمایہ داری کا ایک متبادل تو ہاتھ آیا۔

اوون ہی اُس بڑے نتیجے تک پہنچا تھا کہ سماج کی بہت وسیع طور پر پھیلتی بے چینی کو ریڈیکلوں، ٹوری پارٹی کے whigs یا کسی خاصی مذہبی فرقے کے ذریعے Rational ''کچھ''

سے مشابہہ کچھ کی توقع کرنا نجات کی توقع ناممکن تھی۔

1817 میں اس نے ایک کانگریس میں ایک سینیر سفارت کار سے کہا کہ سائنس کی غیر معمولی ترقی سے یہ ممکن ہے کہ۔۔محض مراعات یافتہ چندلوگوں کو نہیں بلکہ ساری انسانی نسل کو اچھی تعلیم اچھی صحت اور اچھی خوراک دی جاسکتی ہے۔اُس سفارت کار نے اسے ایسا جواب دیا کہ وہ چکرا گیا۔''ہاں،وہ سب لوگ یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں''۔وہ یورپ کے حکمران قوتوں کی نمائندگی کرتے ہوئے بولا''اور یہی بات تو وہ نہیں چاہتے۔اگر عوام خوشحال اور آزاد ہوں تو حکمران طبقات انہیں کیسے کنٹرول کریں گے؟۔تب وہ نہ صرف جائیداد اور خاندان کے خلاف ہوا بلکہ چرچ بھی اس کا مخالف ہوگیا۔اس نے فیصلہ کرلیا کہ یورپ بیمار ہے اور اسے ایک نیا سماج شروع کرنا ہے۔وہ امریکہ چلا گیا اور وہاں ایک مذہبی فرقہ سے 30ہزار انگریز زمین لی۔4جولائی 1826 کو اس نے اعلان کیا کہ''انسانیت تو تین بڑے استحصالیوں سے آزادی لینی ہے:نجی ملکیت Whational اور شادی''۔مگر امریکن بھی یورپین لوگوں جیسے تھے۔بات نہ بنی۔وہ واپس ہوا۔اِس نے انگلینڈ اور آئر لینڈ میں اسی طرح کی کوشش کیں اور بہت سارا پیسہ لگایا۔اس کا کچھ نہ بچا۔

رابرٹ اووون کا سارا کیریئر اس اصول کا طویل reiteration تھا کہ انسانوں کو وہی بنایا جاتا ہے جو تعلیم اور بچپن کے اثرات اسے بناتے ہیں جس پر اس کا کوئی کنٹرول نہ تھا اور اگر غلط چیزوں کی بجائے درست چیزیں پڑھائی جاتیں تو وہ''ریاضی کے precision''کے ساتھ عالمی خوشی اور اچھائی کے ساتھی بن جاتے۔

یہ بتانے کے لیے کہ فرد کا مفاد اجتماع کے مفاد کے ساتھ compatible ہے اس نے وسیع تر سماج کے اندر محود خود انحصار سوسائٹیاں منظّم کی جانی چاہییں۔

اوون دنیاوی شخص نہ تھا۔وہ persistency relent less کے اہل تھا۔اس نے exactitude systematic کے لیے ایک passion کے ساتھ گہری انسانی ہمدردیوں کو ایک خاص طریقے سے ملایا۔اسے اُس صنعتی اور کمرشل نظام کے بدترین پہلوؤں کا خود تجربہ حاصل تھا جو کہ بہت تیز رفتاری کے ساتھ مغربی سوسائٹی پہ نمایاں ہونے چلا آرہا تھا۔

اس بڑے ایجوکیشنسٹ ،اخلاقی مصلح،قوم پرست اور شادی کے ادارے میں اصلاح کنندہ روحانی شخصیت پیسہ بنا کر،خرچ کر کے 858 میں اپنے باپ کی زین والی دکان کے ساتھ والے مکان میں واپس چلا گیا۔جہاں وہ پیدا ہوا تھا۔اور جہاں سے وہ دس برس کی عمر میں نکل گیا تھا اور دنیا میں Fabulous ابھر گیا تھا۔وہ 88 سال کی عمر میں وہیں میں انتقال ہوگیا۔

توماسو کمپنیلا

(5 ستمبر 1568......21 مئی 1639)

توماسو کمپنیلا، فرانس بے کن سے صرف سات برس چھوٹا تھا۔نوجوان نسل کو یہ جاننے کی بھی ضرورت ہے کہ بیکن نے اپنے فلسفے میں تجرباتی سائنس کے ذریعے یہ نتیجہ نکالا کہ انسان اشیاء پر حاوی ہے۔''اس لئے کہ فطرت پر حکمرانی صرف فطرت کی فرمانبرداری کر کے کی جاتی ہے''۔بیکن کی تصوراتی مثالی دنیا میں سائنس کو تہذیب ساز بنادیا گیا ہے جو انسان کو انسان سے جوڑتی ہے، اور خدا

کی محبت کی طرف اس کی راہنما ہے۔(غضب خدا کا، مجھے اتنے بڑے شخص کو متعارف کرانے کے لیے ایک دوسرے بڑے شخص کا سہارا لینا پڑ رہا ہے)۔

تاریخ میں ہمیں لفظ ''رے نے ساں'' بہت ملتا ہے۔ اِس فرانسیسی لفظ کا مطلب ہے: دوبارہ پیدائش۔ یہ یورپ کے اندر 14ویں سے 16ویں صدی کا زمانہ ہے۔ یہ اصل میں فلسفہ میں تیز ترین ترقی کا عہد تھا۔ اُس دور میں ماضی کے گہرے سایوں کے اندر سے جدید دور کے نظریات کے بیج پھوٹے تھے۔ یہ نظریات کا دور تھا، سائنسی ترقی کا دور تھا۔ فرسودگی سے بغاوت کا دور تھا، اور اس کے نتیجے میں بھیانک سزاؤں کا دور تھا۔

اس دور میں عظیم انسانوں کی ایک پوری کہکشاں پھوٹی تھی۔ اپنے اپنے شعبوں بہت بڑے لوگ۔ میں گستاخی کر کے کہتا ہوں کہ یہاں فکر کے عظیم ترین نمائندے نیکولس، ٹیلیسیو، برونو اور کمپنیلا تھے۔ اہم ترین تو خیر برونو ہے۔

ان سب مفکروں کی سوچ میں فطرت کی اہمیت سب سے زیادہ تھی۔ اُن لوگوں نے بالکل ہی ایک نیا نقطۂ نظر یہ پیش کیا کہ فطرت کا ہی مطالعہ کرنا چاہیے۔ کتابوں سے نہیں بلکہ فطرت کے اپنے اعمال سے علم حاصل کرنا چاہیے۔ فطرت، جس پر تجربہ کیا جاسکتا ہے اور جس کے متعلق دلیل بازی کی جاسکتی ہے۔

اُس دور میں جادوگری موجود ہے، اس میں الکیمی ہے (جس کا مطلب ایسا فلسفیانہ پتھر دریافت کرنا ہے جو ہر چیز کو سونے میں بدل سکتا ہو)، اور طب کی تلاش ہے۔

سوائے برونو کے، رے نے ساں کے باقی فلاسفر وحدت الوجودی نہیں ہیں۔ فلکیات کی نیم سائنس میں مگن۔

کمپنیلا بھی رے نے ساں کا فلاسفر ہے۔ وہ رے نے ساں کے آخر والے زمانے کے اہم فلاسفروں میں سے ایک تھا۔ وہ ازمنہ وسطیٰ سے تو کبھی نہیں نکل پایا مگر اس نے انسان اور فطرت کا مطالعہ کیا۔ اور یہ خود بہت بڑی بات تھی۔ یعنی کہ انسان اور فطرت کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ مطلب یہ نکلا کہ زندگی کا علم حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ کمپنیلا چرچ سے بھی وفادار رہا۔ وہ دینیات دان تھا، وہ ستاروں کا علم جانتا تھا اور شاعر بھی تھا۔

لفظ کمپنیلا کا مطلب ہے: ''نقارہ''۔ ہمارا یہ ''نقارہ'' سائنس کے کاز میں اپنی عظیم لگن کی خاطر دہشتناک مصیبتیں جھیلنے کے لئے 5 ستمبر 1568 میں ایک غریب اوران پڑھ موچی کے گھر میں پیدا ہوا۔ وہ حد سے زیادہ ذہین بچہ تھا۔ کمپنیلا کے ساتھ اس نے ''توماسو'' کا لفظ اُس وقت شامل کیا جب 1583 میں وہ لڑکپن ہی میں ڈومینکین فرقے میں شامل ہوا۔

چونکہ وہ غریب تھا اس لئے سکول میں داخل نہ ہوسکا (اور کمال دیکھیے کہ آج پانچ سو برس بعد آپ جیسا علم کا متلاشی اُس ''بےسکول'' انسان کے بارے میں دلچسپی سے پڑھ رہا ہے)۔ وہ کلاس روم سے باہر کھڑا ہوکر علم حاصل کرتا رہا۔

چودہ برس کی عمر میں وہ ایک خانقاہ میں داخل ہوگیا جو کہ اُس زمانے میں غریب لڑکوں کے پڑھنے کا واحد ذریعہ تھا۔ (اب بھی ایسا ہی ہے۔ پاکستان جیسے ملک میں مدرسوں خانقاہوں میں لاکھوں غریب بچے پڑھتے ہیں)۔ یہاں اُس نے زبردست تیز رفتاری اور گہرائی میں تعلیم کے مراحل طے کرنے شروع کردیئے۔ بالخصوص دینیات اور فلسفہ میں۔

مگر، جیسا کہ بڑے ذہنوں کے ساتھ اکثر ہوتا ہے، یہیں خانقاہ ہی میں اس کے دل میں مذہب کے بارے میں شکوک پیدا ہونے لگے۔ اور ہوتے ہوتے وہ پادریوں سے فکری تصادم تک جا پہنچا۔

یہاں سے وہ ایک فلاسفر کے ہاں پہنچا، ٹیلسیو کے پاس، جس کا کہنا تھا: ''سچ کی خصوصیت تجربہ ہے''۔ اور ''اصل اتھارٹی نیچر ہے نہ کہ عقیدہ''۔ اُس نے اُس فلاسفر کے حق میں 1592 میں ایک کتاب لکھی: ''حسیات پر مبنی فلاسفر''۔ مگر بڑے راہب نے اُسے اپنی یہ کتاب چھپوانے کے لئے نیپلز جانے نہ دیا۔ کمپنیلا نے خانقاہ ہی چھوڑ دی۔۔۔۔ اور نیپلز پہنچ گیا۔

وہیں نیپلز میں اس کی خوش قسمتی تھامس مور کی کتاب ''یوٹوپیا'' کی صورت اس پر مہربان ہوئی۔ اس نے یہ کتاب گھول گھول کر پڑھی۔ بلا شبہ اِس کتاب نے اُس پر زبردست اثر ڈالا۔ (پڑھنے کی کتاب ہے، ہوسکے تو آپ بھی ضرور پڑھ لیں)۔

یہیں نیپلز میں وہ علم الفلکیات میں بھی دلچسپی لینے لگا۔اُس زمانے میں یہی علم دستیاب تھا۔پادری اس کی اجازت دیتے تھے۔

کمپنیلا نے بالآخر اپنی کتاب شائع کی۔اس کتاب نے تو چرچ کو غصے اور طیش میں مبتلا کر کے رکھ دیا۔اُسے گرفتار کر کے چرچ کے حکام کے حوالے کر دیا۔اور چرچ نے اُسے ایک پورے سال تک تاریک تہہ خانوں میں حیوانی زندگی کی قید میں رکھا۔اگر اُس کے بااثر دوست نہ بچاتے تو وہ وہیں مرکھپ جاتا۔مگر یہاں ایک دلچسپ وقوعہ ہوا۔اس قید میں اُس کے ذہن سے وہ فقرہ نکلا جو عالمگیر شہرت حاصل کر گیا۔جب پادریوں نے اس سے پوچھا کہ جب کہ ہم نے تمہیں یہ ساری باتیں نہیں بتائیں تو تم نے یہ ساری باتیں کہاں سے سیکھیں،تو اس نے جواب دیا تھا:

’’میں نے مطالعہ کے لئے جتنا تیل جلایا ہے وہ تمہاری زندگی کی پی ہوئی شراب سے زیادہ ہے‘‘۔مگر اے میرے قاری! آپ ایسا فقرہ ہرگز استعمال نہ کریں۔یہ کمپنیلا کو ہی زیب دیتا ہے۔آپ کریں گے تو یہ سراسر غرور ہوگا،تکبر ہوگا۔اور تکبر اور علم تو ایک دوسرے کے دشمن ہوتے ہیں۔ہیں ناں؟۔اِن دونوں میں سے ایک ہی ایک انسان کے ساتھ رہ سکتا ہے،دونوں نہیں)۔

اب کے اُسے نیپلز سے بھی شہر بدر کر دیا گیا۔دوسرے شہر گیا تو وہاں کے بڑے پادریوں نے اس سے دوستی گانٹھ لی اور اس کی ذہانت وعلم کی تعریفیں کرنے لگے۔کمپنیلا شریف آدمی تھا،اُس پر اِن ’’دوستانہ‘‘ ملاقاتوں کا راز اُس وقت کھلا جب اُسے معلوم ہوا کہ اُس کے سارے مسودے انہی پادریوں نے چرا لئے۔

کیا کرتا؟۔اُن زوراوروں سے ٹکر لینا کوئی آسان بات نہ تھی۔وہ پاڈوآ نامی علم وفضیلت کے مرکزی شہر چلا گیا اور اپنی یادداشت سے چوری شدہ مسودے دوبارہ لکھے۔کتاب چھپی‘ نام تھا:’’ٹیلسیو کے دفاع میں‘‘۔

پادری پھر بپھر گئے۔اب تو وہ اُن کے شاہ رگ پہ ہاتھ ڈال چکا تھا۔چنانچہ ہمارا یہ دوست پھر گرفتار ہوا۔اب تو سزا سخت ہونی تھی۔اُس کے دوست پھر اکٹھے ہوئے،انہوں نے بہت غور وخوض سے ایک منصوبہ بنایا اور اُس کو چھڑوالیا۔ابھی آزادی چند قدم کے فاصلے پر تھی کہ رات کو گشت کرنے والے بدبخت سپاہی آن پہنچے۔قیدی جہاں تھا وہیں دوبارہ پٹخ دیا گیا۔

مسیحی ملاؤں نے اسے ہتھکڑیوں میں جکڑا اور جنوری 1594 کو اُسے بڑے ملاّ کی عدالت میں روم روانہ کیا گیا۔ظاہر ہے وہاں اس خطرناک قیدی کو ریسٹ ہاؤس میں تو نہیں رکھا گیا۔وہ تاریک تہہ خانے میں تنہائی کے عذاب جھیلتا رہا۔چوبیس گھنٹوں میں ایک بار اُسے کھانا کھلایا جاتا۔

مگر ایسے ہی برے حالات میں لوگوں نے ’’پھانسی کے سائے تلے‘‘ لکھا ’’دستِ صبا‘‘،لکھی،’’گنبدِ بے در‘‘ لکھا،’’پُرنگ‘‘،اور’’گرند‘‘ لکھے۔کمپنیلا بھی اُسی قبیل کے مہان انسانوں میں سے تھا۔اس نے’’سورج کا شہر‘‘ کے لئے انہی غیر انسانی قید خانوں میں مواد سوچنا شروع کیا۔

مقدمہ پیش ہوا تو کمپنیلا کو اندازہ ہوا کہ اس کے خلاف شہادتوں اور ثبوتوں کے ڈھیر موجود ہیں۔مگر اس نے ججوں کو اپنی کتابوں میں لکھے خیالات کے برعکس آیتیں سنائیں اور خود کو چرچ کے وفادار پیروکار کی حیثیت سے پیش کیا۔منصف پریشان اور تحقیقات مکمل طور پر معطل ہو کر رہ گئیں۔نہ تشدد نے کام کیا نہ لالچ ورشوت نے۔حکام نے 1595 میں اُسے سانتا سینا کی خانقاہ میں منتقل کیا جہاں وہ مزید اٹھارہ ماہ قید رہا۔

ٹریبونل نے دسمبر 1596 میں اپنا فیصلہ سنایا۔چیتھڑوں میں ملبوس کمپنیلا کو ایک سرد صبح سانتا ماریا ڈیلا کے چرچ لے جایا گیا۔اُسے رکوع کروایا گیا۔اور روایتی فارمولا کے تحت کفر پر اپنی شرمساری کے کاغذ پر دستخط کروائے گئے۔ظلم،روح کو نہیں دستخط کو مانتا ہے۔کمپنیلا کو رہا کر دیا گیا۔

مگر دو ماہ بعد پادریوں کی کرخت انگلیاں پھر اُس کے گریبان پہ تھیں۔بہانہ یہ تھا کہ ایک قیدی نے پھانسی پانے سے قبل کمپنیلا کے خیالات کو کافرانہ قرار دینے کی گواہی دی۔الزامات،تحقیقات اور عدالت کی میز پہ ملزم کے بکھرے مسودے اس الزام کے سچ ہونے کی گواہی دے رہے تھے۔پادری ثابت تو کچھ نہ کر سکے مگر دس ماہ تک کمپنیلا کال کوٹھڑی میں یرغمالی رہا۔رہائی پر پادریوں کی مرضی کے خلاف وہ اپنے آبائی علاقے نہ گیا بلکہ ملک کے جنوبی حصوں کو نکل گیا جہاں سپین نے قبضہ کر رکھا تھا۔سپین کی سامراجیت اپنے ساتھ جاگیرداری،رجعت،حاکموں والے

مظالم،غربت اوراستحصال لائی تھی۔کمپنیلا نے یہ سب کچھ اس دورے میں اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ چنانچہ اب اس نے سپین کے خلاف لڑنے کا پکا فیصلہ کرلیا۔ظاہر ہے سازش کا مرکز وہ خانقاہ تھی جہاں کمپنیلا رہتا تھا۔مگر جاسوسی ہوئی اور سپین کے نوآبادکاروں کو خبر ہوگئی۔سارے باغی گرفتار۔کمپنیلا نے پکڑائی نہ دی اور روپوش ہوکر دور پہاڑوں میں بھاگ گیا۔مگر مالک مکان نے اسے ہسپانویوں کے حوالے کردیا۔اس کا والد اور بھائی گرفتار شدگان میں شامل تھے۔اور اس بار لمبی جیل مقدر میں تھی۔ سارے لوگوں نے تشدد کے سامنے ہتھیار ڈال کر سازش کا اعتراف کرلیا۔مگر کمپنیلا نے ہر الزام سے انکار کردیا۔اُن کی لاٹھی اُس کی پیٹھ۔مگر وہ اڑا رہا۔

بچت کی ایک راہ نظر آئی۔گورکی کے کاموکی طرح کمپنیلا نے خود کو پاگل بنا دیا۔ماہر سے ماہر ڈاکٹر بھی سازش کے لیڈر کی مہارت نہ جان سکے۔اور جان نکال دینے والے تشدد کے بعد اُسے پاگل ہی قرار دیا گیا۔خطرناک کمپنیلا نے سزائے موت سے بچ کر عمر قید کی سزا پائی۔

ادھ موا کمپنیلا اپنے ذہن میں ''سورج کا شہر'' نامی کتاب کا مواد کب سے لیے پھر رہا تھا۔اب اس نے سوچا کہ اپنی کتاب ڈکٹیٹ کروائے۔اُس نے حکام سے مطالبہ کیا کہ اس کے ساتھیوں کو اس کے سیل منتقل کیا جائے تاکہ اُسے پانی تو پلوا سکیں۔قسمت کا مذاق دیکھو کہ حکام نے اس کے باپ اور بھائی کو اُس کے سیل منتقل کردیا جو کہ اس کی خدمت تو خوب کرتے تھے مگر اُس سے ڈکٹیشن نہیں لے سکتے تھے۔اَن پڑھ جو تھے۔

چنانچہ وہ خود لکھنے میں جُت گیا۔باپ حیران تھا کہ درد کے ہاتھوں مرجانے کی حد تک پڑا کمپنیلا کیا ضروری چیز لکھنے کی مشقت کررہا ہے۔

''سورج کا شہر'' کمپنیلا کی سب سے اہم تصنیف ہے۔اس کتاب میں وہ ایک تصوراتی (یوٹوپیائی) کمیونسٹ ریاست کا تصور پیش کرتا ہے۔اس ریاست میں ایک فطری مذہب ہوتا ہے جس کو فطری قوانین چلاتے ہیں۔وہ اس ریاست کے سربراہ کو''سورج بادشاہ'' کہتا ہے۔تین وزیر سورج بادشاہ کی مدد کرتے ہیں:ایک کا نام قوت ہے،دوسرے کا دانائی اور تیسرے کا محبت۔اس ریپلک میں ساری جائیداد،نجی گھر،اور خاندان کا خاتمہ کیا جاتا ہے۔''سورج کا شہر'' جنیوا کے ایک جہاز راں (جو امریکہ تک سمندری سفر میں کولمبس کے ساتھ رہا تھا) اور ایک نواب ہاسٹپلر کے درمیان ایک شاعرانہ ڈائیلاگ کی صورت میں ہے۔اس کتاب کا لب لباب ایک مثالی سماج کو بیان کرنا تھا جو اصل دنیا کے تشدد، بدنظمی اور غیر عقلی پن کے برعکس فطرت سے ہم آہنگ تھا، جسے خدا کے اندرونی'' آرٹ'' اور دانائی کے اظہار کے بطور سمجھا جائے۔کمپنیلا مکمل طور پر قائل تھا کہ آج کا معاشرہ ناانصافی اور ناخوشی کی بھول بھلیاں ہے۔اس لئے کہ انسان اِس فطری ماڈل سے روگردانی کرگیا تھا۔ایک شہر میں جتنی زیادہ ہیئتِ سیاسی ہوگی، وہ اتنا زیادہ مسرور ہوگا،اس کے انفرادی حصے اس طرح مربوط ومنسلک ہوں کہ وہ ایک متحد جسم بنے اور اس کے مختلف بازو، کام کے لحاظ سے متنوع، مگر سماجی بہبود کی خاطر مکمل طور پر ہم آہنگ ہوں۔

''سورج کے شہر'' میں کوئی پیشہ حقیر یا کم اہمیت والا نہیں ہے، بلکہ سب کے سب پیشے مساوی اور باوقار ہیں۔اصل میں دستکار اور راج مستری جیسے ورکرز،جن کو زیادہ محنت خرچ کرنی پڑتی ہے،کو زیادہ تعریف ملتی ہے۔یہاں ہر شخص کے لئے کام کے سارے شعبوں سے واقفیت لازمی ہے، پھر ہر شخص کو اُس کام میں جت جانا ہے جس کی طرف اُس کا رجحان سب سے زیادہ ہو۔

اِن لوگوں کے پاس کوئی نوکر نہیں ہیں۔اور کوئی سروس بے کار نہیں سمجھی جاتی۔جس بات کو یہ لوگ سب سے زیادہ قابلِ نفرت سمجھتے ہیں وہ ہے بے کار بیٹھنا۔یوں ساری آبادی کام کی عظمت کی قائل ہے اور بے عملی اور پھکڑ پن سے وابستہ،اشرافیہ والی بے ہودگی کے تصور کو مسترد کرتی ہے۔محنت کی مساوی تقسیم کی برکت سے ہر فرد کے لئے روزانہ چار گھنٹے کام کرنا کافی ہوتا ہے۔مگر یہ ضروری ہے کہ وہ سب کام کریں اس لئے کہ ایک کے بیکار بیٹھنے سے دوسروں کی کاوشوں پر اثر پڑتا ہے۔ شہری کے پاس کچھ نہیں ہوتا،اس کے برعکس وہ خوراک سے لے کر گھر تک،حصولِ علم سے لے کر سرگرمیوں تک،اعزازات سے لے کر تفریح تک ہر نعمت سے مالا مال ہیں۔

کمپنیلا کے یوٹوپیائی شہر''سورج کا شہر'' کی دیواریں نقش ونگار والی ہیں۔یہ تو شہر کی فصیل ہی نہیں یہ غیر معمولی تھیٹر کے پردے،اور علم کے مفصل انسائیکلوپیڈیا کے صفحے بھی ہیں۔محلات کی دیواریں بھی آرٹ اور سائنس کی تصاویر سے پینٹ کی ہوئی ہیں۔اس کتاب میں مندر کے

ستونوں والی دیوار سے لے کراور رفتہ رفتہ بڑے دائروں میں اتر کر، جس طرح کہ مرکری سے لے کر زحل سیارہ ہوتا ہے، آسمانوں اور ستاروں کی تصاویر سے ہمارا سامنا ہوتا ہے، میتھ کے ہندسوں سے، روئے زمین پہ موجود ہر شہر سے، اور معدن، سبزی اور جانوروں کی دنیاؤں کے رازوں سے سامنا ہوتا ہے جب تک کہ ہم انسانوں تک پہنچتے ہیں۔ باہر کی دیوار پر قوانین کو ظاہر کیا گیا۔ علم لائبریریوں کی طرح الگ کتابوں میں بند نہیں ہے بلکہ کھلے عام ہر آنکھ کو نظر آتا ہے۔ اس منظر سے سیکھنے کا عمل تیز اور آسان ہے۔

اِس کتاب کے آنے سے پادریوں کے نظریات کا تو سمجھو لباس اتر چکا تھا۔ اب تو وہ آپے سے باہر ہو گئے۔ پاگل پر کون مقدمہ چلاتا ہے مگر ملاّ انسانی حقوق اور جنیوا کنونشن کہاں مانتے ہیں خواہ زمانہ کمپنیلا کا ہو یا ڈاکٹر نجیب کا۔

جنوری 1603 میں کمپنیلا کو عمر قید کی سزا ہوئی۔ اسی دوران اُسے گیلیلو کے انجام کے بارے میں معلوم ہوا۔ اس نے اُس ماہر فلکیات کو بہت سراہا۔ اور بائبل سے حوالے دے دے کر بتایا کہ گیلیلو کی تعلیمات انجیل مقدس سے متصادم نہیں ہیں۔ اس نے ''گیلیلو کا دفاع'' لکھا جس میں اس نے کوپرنیکس کے نظام کا دفاع کیا اور فطرت کو الہامی کتابوں سے جدا کر دیا۔ وہ گیلیلو کا دلدادہ تھا اور کئی سالوں تک اس سے خط و کتابت میں رہا تھا۔

کمپنیلا جیل میں سڑتا رہا۔ اب اس کی کتابیں پروٹسٹنٹ جرمنی میں چھپنا شروع ہو گئیں۔ سال 1600 میں ''سپین کی بادشاہت''، 1601 میں ''سیاسی اقوال زریں''، 1605-1607 میں ''کفر پہ فتح''، 1606 میں ''قید خانے کی یادداشت''، 1623-1609 میں ''مابعد الطبیعات''، 1624-1613 میں ''تھیالوجیا''...........اور پھر اُس کی سب سے مشہور تصنیف ''سورج کا شہر''۔

27 سال جیل کاٹنے کے بعد 23 مئی 1926 کو اس بڑے انسان کو رہائی نصیب ہوئی۔ وہ بھی اس لئے کہ ہسپانوی وائسرائے کا پوپ کے مقامی نمائندے سے جھگڑا ہو گیا۔ وائسرائے نے خار میں آکر تماسو کمپنیلا کو رہا کر دیا۔

مگر ایک ماہ رہائی کے بعد پوپ کے لوگوں نے اُسے اغواء کر لیا اور وائسرائے کی حدود سے باہر ایک بار پھر چرچ کے جیل میں ڈال دیا۔

ایک دن تقدیر اس پر اچانک راضی ہو گئی۔ پوپ اور سپین کے بادشاہ میں سخت جھگڑا ہوا اور پوپ کی جان کو خطرہ ہوا۔ کمپنیلا نے یہاں وہ کھیل کھیلا جو رہتی دنیا تک یاد رکھا جائے گا۔ اس نے مشہور کر دیا کہ وہ تقدیر کو بدلنے کا علم جانتا ہے۔ یہ خبر بزدل پوپ تک پہنچی تو اس نے اپنے عقیدے اور مذہب کے برخلاف اس بات پر یقین کر لیا۔ جو پوپ کل تک ایسی بات کرنے والے کو کافر قرار دے کر موت کے گھاٹ اتار دیتا تھا، آج اُس نے اپنی جان بچانے کی خاطر خدا کی بنائی ہوئی تقدیر کو بدلنے کے دعوے دار کمپنیلا کو رہا کر دیا۔۔۔۔ باعزت رہائی۔ جی ہاں، چرچ نے خدا کے سب سے بڑے دشمن کو 50 قید خانوں میں 33 سال جیل دے کر رہا کر دیا۔ صرف یہی نہیں بلکہ کمپنیلا تو خدا کے سب سے بڑے نام نہاد ٹھیکیدار ''پوپ'' کو نچواتا رہا۔ کبھی دیکھو تو وہ آتش دان کو سجدہ کر رہا تھا، کبھی خدا مخالف بھجن گا رہا تھا، اور کبھی بت پرستی اور آتش پرستی کر رہا تھا جنہیں ایک وقت وہ کافر کہہ کر جلایا کرتا تھا۔

فادروں، اور سسٹروں کا سردار ''خدا کی رضا'' کو تبدیل کرنے میں لگا ہوا، ''جنت'' کی طرف اپنی روانگی کو ملتوی کروا رہا تھا اور اِس ''بری'' دنیا میں اپنے قیام کو طویل کر رہا تھا۔۔۔۔

اس دوران کمپنیلا نہ صرف پوپ کا باعزت مہمان اور مشیر تھا بلکہ اُسے اپنے ضبط شدہ مسودے بھی مل گئے۔

مگر، ایک بار پھر کمپنیلا نے وطن کی آزادی کے لیے خفیہ سازش تیار کی اور ایک بار پھر یہ سازش اپنوں کی جاسوسی کا شکار ہو گئی۔ ہسپانویوں نے سارے ساتھی گرفتار کر لیے۔ اور اب کمپنیلا کے لئے جائے پناہ صرف ایک تھی، سپین کا دشمن فرانس۔ وہ فرانس کے سفیر کے نوکر کی وردی میں فرانس فرار ہوا۔

وہاں لوئی سیز دھم کے دربار میں اس کی خوب آؤ بھگت ہوئی۔ شاہِ فرانس نے اس کی باقاعدہ پنشن مقرر کر دی۔ یوں وہ اپنی زندگی کے آخر تک وہاں ''شہرت و خیرات'' میں رہتے ہوئے

مطالعہ اور تدریس میں مصروف رہا۔
کمپنیلا اکہتر سال کی عمر میں 21 مئی 1639 کو پیرس میں انتقال کر گیا۔

جین ملیئر
(1729----1664)

جین ملیئر 1664 میں فرانس کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں پیدا ہوا۔ اس کے والدین جیرالڈ ملیئر اور محترمہ سمفورین اونی کپڑا بُننے کا کام کرتے تھے۔ بچے کو وہیں گاؤں کے پادری سے مذہبی تعلیم دلائی۔ یوں ملیئر ایک گاؤں میں پادری بن گیا۔ اور ساری زندگی وہیں گزار دی۔

پادری جین ملیئر کچھ زیادہ مجلسی نہ تھا۔ وہ کم آمیز آدمی تھا۔ اُس کا سارا وقت مطالعہ میں گزرتا۔ فلسفہ اور کلاسیکی ادب اُس کے پسندیدہ مضامین ہوا کرتے تھے۔

یہ علاقہ کسان بغاوتوں کی تاریخ سے بھرا پڑا تھا۔ اس تاریخ سے متاثرہ جین ملیئر کسانوں کو ایک انقلابی طبقہ سمجھتا تھا۔ اور اُن سے بہت محبت کرتا تھا۔ اس نے ایک مقامی جاگیردار کے خلاف مہم چلائی جو کہ کسانوں پر ظلم کرتا تھا۔ اس نے خطبوں میں اس کا نام لینا چھوڑ دیا۔ بڑا پادری اپنے مربی جاگیردار کی جان چھڑانے دوڑا دوڑا آیا۔ مگر جین ملیئر اپنی بات پہ اڑا رہا۔

وہ جائیداد کو ''انسانیت کا دشمن'' سمجھتا تھا اور جائیداد کے طرفداروں کو، خواہ وہ دانشور تھے، یا ملاّ، شیطان قرار دیتا تھا۔ وہ ایک ایسے سماج کی وکالت کرتا تھا جہاں چرچ، پادری اور ذاتی جائیداد موجود ہی نہ ہوں۔ مگر یہ سب کچھ وہ کہتا نہ تھا۔ بلکہ خطبوں میں تو وہ عوام الناس سے جاگیرداروں کی تابعداری کرنے کی تلقین کرتا تھا۔ وہ دل میں تو ملاؤں اور فیوڈلوں کی باتوں سے نفرت کرتا تھا مگر زبانی اظہار کرنے کی جرات نہیں کرتا تھا۔ یوں وہ زندگی بھر دو شخصیتوں والے عذاب میں جیتا رہا۔

مگر وہ تو مرکر' سوالاکھ کا نکلا۔ اس لیے کہ جین ملیئر نے پونے چار سو صفحات پر مشتمل ایک ''وصیت نامہ'' چھوڑا۔ اس طرح وہ خود سزاؤں اور پابندیوں سے بھی بچا رہا اور وہ پیغام بھی بجا طور پر لوگوں تک پہنچا لیا جو اُس کی آدرش تھا۔

ملیئر نے اپنے اِس وصیت نامے میں چرچ اور حکومت دونوں کو ''دوجیب کترے'' کہا۔ اس کے بقول یہ دونوں انسانوں کو دھوکہ دینے اور پھر لوٹنے میں ساتھ ہوتے ہیں۔

ملیئر نے کہا کہ ایسا لگتا ہے کہ کچھ لوگ دوسروں پر ممتاز ہونے اور زندگی کی تمام اچھی چیزوں سے لطف اندوز ہونے کا واحد مقصد لے کر پیدا ہوئے' جب کہ اس کے برعکس دوسرے لوگ (غربت زدہ، دھتکارے ہوئے اور آلام زدہ لوگ) کمر توڑ مشقت اور تذلیل کے بوجھ تلے اپنی زندگیاں سڑانے گلانے کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ ایسی نا برابری یقیناً غیر منصفانہ ہے۔ سارے لوگ برابر پیدا ہوئے۔ زندہ رہنے کا اُن سب کا برابر کا حق ہے۔ انہیں آزادی اور زندگی کی اچھی چیزوں کے حقدار ہونے کا یکساں حق ہے۔

ملیئر چرچ سے وابستہ عملے کی کثیر تعداد کی مخالفت کرتا ہے جو نہ کام کرتے ہیں نہ کاج۔ مگر مفت کی اعلیٰ کھاتے ہیں، اعلیٰ پیتے ہیں اور اعلیٰ رہائش رکھتے ہیں۔

ملیئر ریاست کو جائیداد والوں کی لونڈی قرار دیتا ہے۔ وہ ریاست کو ''قانونی ڈاکو'' کہتا ہے۔

اُس کی نظر میں جرم اور نجی ملکیت ایک دوسرے سے لازم و ملزوم انداز میں جڑے ہوئے ہیں۔

ملیئر انسان کی فلاح کا ایک ہی طریقہ جانتا ہے: نجی جائیداد کا خاتمہ۔

دھرم کے معاملے میں ملیئر نے ایک کو رد کر کے دوسرا فرقہ کھڑا نہ کیا۔ بلکہ اس نے تو ہر طرح کے دھرم کو مسترد کر دیا۔

ملیئر کو معلوم تھا کہ سرکار اور پادری اس کے ''وصیت نامے'' کو غائب کر دیں گے۔ اس لئے اس نے اس کی تین کاپیاں تیار کیں۔ ایک کاپی حفاظت سے رکھنے کی خاطر بیلف کو دے دی۔ اور دو کاپیاں اس کی موت کے بعد اُس کے کاغذوں میں ملیں۔ حکام نے اس باغی پادری کی دونوں کاپیوں کو بڑی پھرتی سے غائب کر دیا مگر تیسری کاپی کا اُن کے فرشتوں تک کو بھی معلوم نہ ہوا۔ اٹھارویں صدی کے وسط تک پیرس اور دوسرے یورپی شہروں میں ''وصیت نامہ'' ایک بہت ہی مشہور کتاب کی صورت فروخت ہو رہی تھی۔ یہ کتاب گویا یورپ میں جاگیرداری پر ایک کاری ضرب تھی۔

شہنشاہوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا کہ ''وصیت نامہ'' مقبول نہ ہونے پائے مگر چونکہ یہ عوام کے موڈ اور ذائقے کے مطابق تھی اس لئے یہ مقبول ترین کتاب رہی۔ حکومت نے ایک نادر شاہی فرمان تک جاری کیا۔ اس نے دھرم، بادشاہت اور سماجی نظام کے خلاف مواد چھاپنا اور بانٹنا ممنوع قرار دے دیا اور پابندی نہ کرنے والوں کے لئے کربناک سزا مقرر کی۔ مگر سب کچھ دھرے کا دھرا رہ گیا۔ کسی نے کچھ نہ مانا۔

ملیئر کا ایک اور کمال یہ تھا کہ اس نے ہمارے ہاں کے عام لوگوں کی طرح یہ نہ کہا کہ ''ملک کو

ٹھیک کرنے کے لئے کسی خمینی، یا کسی ہٹلر کی ضرورت ہے۔ اس نے واضح طور پر کہا کہ ظلم واستحصال سے نجات خود عوام کو حاصل کرنا ہے۔ اس معاملے میں کسی اور پر انحصار کیا ہی نہیں جا سکتا۔ اور کوئی ایسی طاقت ہے ہی نہیں جو انہیں آزادی دلائے۔ یہی بات اُسے دوسرے تمام ہم عصروں بلکہ انیسویں، بیسویں اور اکیسویں صدی کے ٹی وی دانشوروں، مفکروں سے ممتاز بناتی ہے۔ وہ انقلابی طریقوں سے عوام کی نجات کو ممکن سمجھتا تھا۔

دوسری اہم بات یہ تھی کہ وہ دھرم کو ریاست وسیاست سے الگ رکھنا چاہتا تھا اور،

تیسری خوبصورت بات یہ تھی کہ اس نے ایک کمیونسٹ معاشرے کا تصور دیا تھا۔

جیرارڈ ونسٹن لے

(1652..........1609)

ہمارے خطے کے شاہ عنایت شہید کا ایک ہم عصر، سات سمندر دور یورپ میں نظر آتا ہے۔ یہ جیرا رڈ ونسٹین لے تھا۔ ہمارے بکواس بیوروکریٹ جب بھی بیرون ملک حرام کے پیسے سے جاتے ہیں تو پلوں، عمارتوں، نائٹ کلبوں کی تصویریں فیس بک کرلیتے ہیں۔ مجھے آج تک یہاں سے برطانیہ جانے آنے والے نے لنکا شائر کے بارے میں کبھی کچھ نہیں بتایا۔ ہمارا ''یہ'' شاہ عنایت وہیں تو پیدا ہوا تھا۔ یہ اکتوبر 1609 تھا جب ہم بلوچ چاکر و گوہرام کی صورت ابھی ابھی آپس میں لڑکر کر اپنے سبی شوران سے بے گھر ہوکر ''ست گھرا'' اور ہندوستانی گجرات میں اپنے زخم چاٹ رہے تھے۔

ہمیں جیرارڈ کی اوائل عمری کی زندگی کے بارے میں زیادہ معلومات میسر نہیں ہیں۔

اتنا معلوم ہوسکا کہ 1630 کو وہ لندن جاتا ہے اور کپڑے کی دوکانداری سیکھنے لگتا ہے۔ پھر اپنا کاروبار شروع کرتا ہے۔ کچھ کچھ پیسے اکٹھے کرتا ہے، شادی کرتا ہے۔

مگر 1642 میں وہاں خانہ جنگی کے نتیجے میں اس کا کاروبار تباہ ہوجاتا ہے اور لنگ ولاش جیرارڈ اپنے سسر کی مدد سے زراعت اور مویشی بانی میں لگ جاتا ہے۔

چونکہ چرچ پر سے اُس کا ایمان اٹھ گیا تھا اس لیے اب وہ مقدس صحیفوں کی ازسرِ نو تشریح کرنے لگا۔ اسی اثناء میں اس کا ایک دوست بلاسفیمی میں گرفتار ہوا تو اس نے پادری پنڈت کے اس اختیار کو چیلنج کیا۔ اس نے فرد اور خدا کے درمیان پادری کے رول کو غیر ضروری قرار دیا۔ کیا خدا نے زمین اس لیے بنائی کہ چند متکبر مستی اور خرمستی کی زندگی گزاریں۔ کیا چند امیر اور مقتدرہ لوگوں کو زمین اور جائیداد کی خودغرضانہ خرید و فروخت کا آفاقی حق حاصل ہے۔ کیا انہیں یہ اختیار ہے کہ وہ عام انسان کو لوٹیں؟۔ اس کی کتاب کا نام تھا: The new Law of Reighteousness۔ یہ کتاب 26 جنوری 1649 میں چھپی۔ چار ہی دن بعد بادشاہ چارلس کیم کا سر قلم کردیا گیا۔ انگلینڈ کو ''دولتِ مشترکہ اور آزاد ریاست'' قرار دیا گیا۔

برطانیہ کے اندر یکم اپریل 1649 میں اچھے اور صاف نیت لوگوں کا ایک چھوٹا سا گروپ قائم ہوا۔ انہوں نے بکھنگم شائر، سُرے، کینٹ اور نارتھمپٹن شائر نامی علاقوں میں خالی اور مشترکہ زمینوں پر کاشت کرنا شروع کردیا۔ اور فصل سارے کاشتکاروں میں تقسیم کرنی شروع کی۔ انہوں نے اپنا نام levellers (زمین ہموار کرنے والے، یا مساوات قائم کرنے والے)۔ لیولرز کا عقیدہ مسیحی کمیونزم پر مبنی تھا۔ یہ لوگ صبح سے لے کر شام تک کھیتوں میں کام کرتے تھے۔ کبھی کبھی یہ لوگ آس پاس کے دیہاتوں میں پھیل جاتے تھے اور دیہاتیوں کو اپنی ٹولی میں شامل ہونے کی تبلیغ کرتے تھے۔ سب سے محنت کرنے کی اپیلیں کرتے تھے یعنی سماجی محنت۔ وہ تقسیمِ محنت اور تقسیمِ پیداوار دونوں کو سماجی بنانا چاہتے تھے۔ اسی طرح وہ ملکیت کو بھی سماجی بنانے کا نظریہ رکھتے تھے۔

یہ بات مقامی جاگیرداروں کے لئے خوف و ہراس کا باعث بنی۔ ''مشترکہ زمین پر ہل چلانا'' اور ''دوبارہ پنچائیت قائم کرنا'' جیسی انقلابی خبریں آس پاس پھیلتی پھیلتی دارالحکومت لندن تک پہنچیں۔ اور اس طرح پہنچیں کہ گویا یہ گروہ لوگوں کی جائیداد و ملکیت پر زبردستی قبضہ کرنا چاہتا ہے۔

یہ بات جاگیرداروں کے لئے گویا موت کا پیغام تھی۔ دارالحکومتیں تو نجی ملکیت کی حفاظت کے لیے قائم ہوتی ہیں۔ چنانچہ لندن کے حاکموں نے فوراً ایک فوج بھیجی کہ ان ''ہموار کرنے والوں'' کو تباہ و برباد کرے۔ مگر جب فوج وہاں پہنچی تو دیکھا کہ وہاں نہ توپیں ہیں نہ بندوقیں۔ نہ کوئی بغاوت ہوئی نہ کسی قسم کا انقلاب وقوع پذیر ہوگیا ہے۔ انہوں نے محض بیس کسان دیکھے جو زمینوں پہ ہل چلا رہے تھے، محنت مشقت کررہے تھے۔ فوج شرمندہ ہوکر واپس ہوئی۔

مگر 1650 میں جاگیرداروں کے بھیجے ہوئے غنڈوں نے ان کسانوں کو مارا پیٹا اور اُن کی کالونی کو تباہ کردیا۔

ونسٹن لے لنکا شائر میں پیدا ہوا تھا۔ اس کا والد کپڑے اور ریشم کا کاروبار کرتا تھا۔ اس نے دیہاتی سکول میں چند سال کی واجبی تعلیم حاصل کی۔ البتہ وہ انجیل مقدس سے خوب آشنا تھا۔

''ہموار کرنے والوں'' نے سرکار کو اپنا مافی الضمیر بتانے کے لئے جیرارڈ ونسٹن لے کو لندن بھیجا۔ مگر لندن (اسلام آباد) کے حاکموں کی کھوپڑی میں بھیجا تو ہوتا نہیں ہے۔ اس کی کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ تب جیرارڈ نے قلم اٹھانے کا فیصلہ کرلیا تاکہ دنیا کو اپنے نظریے سے آشنا کردے۔ اور اس تقریباً تقریباً اَن پڑھ آدمی نے بائبل کی مدد سے پمفلٹ لکھنے شروع کردیے۔

یہ دراصل ایک خانہ جنگی نہ تھی بلکہ تین خانہ جنگیاں تھیں۔ ان جنگوں میں شامل گروہوں کے اندر

شاہ پرست تھے جو شاہ چارلس اول کی حمایت کرتے تھے۔ دوسرے پارلیمانی لوگ تھے جنہیں round heads کہا جاتا تھا (بعد میں جن کی قیادت اولیور کرامویل نے کرنی تھی)۔ پھر کچھ لوگ آسمان (خدا) کی بادشاہت قائم کرنا چاہتے تھے۔ ان میں وہ لوگ بھی تھے جو حکومت کی سیاسی روشن خیال اصلاح کے لیے جدوجہد کرتے تھے جنہیں اُن کے مخالفین ''Levellers'' (مساوات قائم کرنے والے) کہا کرتے تھے۔ ان گروہوں میں مسیحی کمیونسٹ بھی شامل تھے جو خود کو اپنے عقائد کے حوالے سے ''اصلی لیولرز'' کہتے تھے۔ مگر انہیں اُن کے افعال کی بنا پر "Diggers" کہا جاتا تھا۔ انہی ڈِگرز کی قیادت جیرارڈ ونسٹن لے کر رہا تھا۔ وہ جائیداد کی ملکیت کو level (مساوی) کرنا چاہتا تھا۔ اسی لیے تو اس کے ساتھی خود کو ''حقیقی لیولرز'' کہتے تھے۔

انگلینڈ میں بورژوا انقلاب آیا۔ پارلیمنٹ نے عوام الناس کی وسیع حمایت سے بادشاہ کو شکست دی۔ لوگ فیوڈل نظام سے بیزار بیٹھے تھے۔ اُن کے لئے سرمایہ داری بھی ایک بڑا انقلاب تھا۔ اس پارلیمنٹ کی قیادت کرامویل کر رہا تھا۔ بادشاہ گرفتار کیا گیا تھا اور حواریوں سمیت اس کی جاگیریں بورژوازی کے قبضے میں چلی گئیں۔ غریب کو تو ملنا کچھ نہ تھا۔ مگر اس بڑی جدوجہد میں ان کا شعور بہت بڑھا۔ یہ دلچسپ ہے کہ ایک مخلوط تحریک میں غریب کو کبھی کچھ نہیں ملتا۔ بس ''شعور'' ملتا ہے۔ اور جب یہاں بھی غریب کو پتہ چلا کہ اُن کے دن نہیں بدلے تو اُن کے اندر بے چینی تو پھیلنی ہی تھی۔

اس طرح 1647 تک سماج' اور پارلیمنٹ دو واضح حصوں میں بٹ گئے۔ ایک طرف میانہ رو بورژوازی تھی، اور دوسری طرف ریڈیکل ڈیموکریٹس یعنی ''زمین ہموار کرنے والے تھے''۔ میانہ رو بورژوازی بادشاہت قائم رکھنا چاہتی تھی اس لئے کہ اُس میں عوام کو زیرِ نگیں رکھنے کے ذرائع نظر آتے تھے۔ جبکہ ''زمین ہموار کرنے والے' یا مساوات قائم کرنے والے'' بادشاہ کی پھانسی کا مطالبہ کر رہے تھے۔ اور بادشاہت کا خاتمہ چاہتے تھے۔

انہی طوفانی حالات میں ونسٹن لے نے دسمبر 1648 میں ایک پمفلٹ لکھا: ''بکھنگم شائر میں روشنی''۔ اس پمفلٹ میں شاہی اقتدار کی مخالفت تو تھی ہی، مگر ساتھ میں چرچ کو بھی نشانہ بنایا گیا جو کہ بادشاہت کے دوام کا مددگار رادارہ تھا۔ اس نے اس پمفلٹ میں عوام کو پارلیمنٹ سے بھی خبردار کیا۔ اس کی دلیل یہ تھی کہ عوام نے بادشاہ سے اقتدار چھین کر اُس اقتدار کو اپنے پاس نہیں رکھا بلکہ اُسے پارلیمنٹ کی جھولی میں رہن رکھ دیا اور خود اُسی طرح محروم رہے۔

یہ پمفلٹ اس قدر کامیاب اور مقبول ہوا کہ جلد ہی ایک اور پمفلٹ نمودار ہوا۔ اس کا عنوان تھا: ''بکھنگم شائر میں مزید روشنی''۔ اس پمفلٹ میں مزید بنیادی باتیں رکھی گئیں۔ اس پمفلٹ سے پہلے شہنشاہیت کا خاتمہ تو ہو چکا تھا۔ مگر اس کے قائم کردہ گرانٹ، وظیفے، خصوصی رعایتیں اور اجارہ داریاں موجود تھیں۔ پملفٹ میں اُن سب کے خاتمے کے لئے دلائل دیئے گئے۔

ونسٹن لے نے ''ہموار کرنے والوں'' پر بھی اعتبار نہ کیا۔ اس لئے کہ وہ لوگ معتدل تھے اور بورژوازی کی ذاتی ملکیت کی تعریف کرتے تھے۔ چنانچہ اس کی قیادت میں ایک نئی تنظیم قائم کی گئی: ''حقیقی ہموار کرنے والے''، یعنی ''حقیقی مساوات والے''۔

اس کے اگلے پمفلٹ کا نام تھا: ''راستی کا نیا قانون''۔ یہ جنوری 1649 میں نمودار ہوا۔ یہ ایک اہم اور بنیادی پمفلٹ تھا۔ جو مسیحی کمیونزم کی وکالت کرتا تھا۔ اس پمفلٹ نے تو نجی ملکیت ہی کو برائی کی جڑ قرار دیا۔ اِس کمیونسٹانہ عقیدے کی بنیاد نیو ٹیسٹامنٹ میں ''جان کی کتاب'' کے بعد کے حصے یعنی' Book of Acts کے باب دوئم کی ورس نمبر 44 اور 45 سے آئی:

''وہ سب جو خدا پر ایمان رکھتے تھے اکٹھے تھے اور ان کی سب چیزیں مشترک تھیں؛ وہ اپنے مال واسباب اور اشیاء بیچتے تھے اور محاصل کو سب میں تقسیم کرتے تھے، جتنی جس کو ضرورت ہوتی تھی''۔

ونسٹین لے نے دلیل دی کہ ''وقت کے اوائل میں عظیم خالق نے زمین کو ایک مشترکہ خزانہ بنایا تاکہ چرند، پرند، مچھلیاں اور انسان سب کو بقا حاصل ہو۔ انسان کو درندوں، پرندوں اور مچھلیوں پر بالادستی دی گئی۔ مگر شروع میں ایک لفظ بھی ایسا نہ کہا گیا کہ انسانوں کی ایک شاخ دوسری شاخ پہ حکمرانی کرے۔

''مگر جب جسم نے خود کو سماعت، بصارت، ذائقہ، سونگھنے اور محسوس کرنے کے پانچ حواس کے حصار میں گرفتار کر لیا، تو وہ دماغ کے اندھے پن اور دل کی کمزوری میں گھر گیا اور اب وہ ایک استاد اور حکمران کی تلاش کرتا ہے۔ یوں خودغرض تصورات پانچوں حواس پر قبضہ کرتے ہیں، اور ....

ایک شخص دوسرے کو پڑھانے اور حکمرانی کرنے پر مامور ہوا اور لہٰذا روح قتل کی گئی اور انسان زنجیروں میں جکڑ گیا، اور خود اپنی نسل کا اُس سے بڑا غلام بنا جتنا کہ کھیتوں کے وحشی جانور اُس کے غلام تھے .... اور یوں زمین (جو کہ حیوانوں اور انسانوں دونوں کی راحت کے لئے ایک مشترک خزانہ کے بطور بنائی گئی تھی) پر حکمرانوں کے ہاتھوں باڑ لگایا گیا، اور دوسروں کو نوکر اور غلام بنا دیا گیا۔ اور زمین جسے سب کے لئے سٹور ہاؤس کے بطور پیدا کیا گیا تھا، کو خریدا اور بیچا جا رہا ہے، اور چند لوگوں کے ہاتھ میں رکھا جا رہا ہے۔۔۔۔

''اگر آپ دیکھیں تو نظر آئے گا کہ جاگیردار، استاد اور حکمران، ظالم ہیں، قاتل ہیں، اور چور ہیں۔ مگر شروع سے ایسا تو نہ تھا''۔۔۔۔

وہ لکھتا ہے: ''میرے خیال میں حقیقی سچائی معاشرہ کو بتاتی ہے کہ وہ زمین کو سارے شاہ پرستوں، لارڈز اور ظالم جاگیرداروں کی غلامی سے آزاد کرے، جو کہ اُن کے ہاتھوں میں فتح کے بطور اس طرح آئی جیسے کہ شاہراہ پر ایک چور ایک سچے انسان سے طاقتور ہونے کی بناء پر اُس کا بٹوہ چھین لے''۔

ونسٹن لے کے نظام میں سارے بے کار اور بھکاری لوگ کام پر لگا دیئے جائیں گے۔

وہ جاگیرداروں کو یوں مخاطب کرتا ہے:

''زمین اور جائیداد کی ملکیت تمہارے آباؤاجداد نے تلوار کے ذریعے ہتھیالی تھی۔ انہوں نے پہلے تو اپنے ساتھی مخلوق یعنی انسان کو قتل کر دیا اور پھر اس کی زمین چوری کی، یا اُس پر قبضہ کیا۔ اور یہ زمین اُس کی اولاد یعنی تم تک پہنچی۔ لہٰذا گو کہ تم نے قتل یا چوری نہیں کی مگر تم نے وہ لعنتی چیز تلوار کے زور سے اپنے قبضے میں رکھی ہے۔ اسی لیے تم اپنے آباؤاجداد کے مکار کارناموں کو جائز بتاتے ہو۔ تمہارے آباء کا گناہ تمہارے اور تمہارے بچوں کے سر پر منڈلاتا رہے گا، جب تک کہ تمہاری خونی اور چوری والی قوت زمین سے اکھاڑ نہیں پھینکی جاتی''۔

اس پمفلٹ میں نجی ملکیت کو ساری برائیوں کی جڑ قرار دیا گیا اور اس سے چھٹکارا پانے کی وکالت کی گئی تھی۔ متبادل نظام کے بطور ''دوبارہ زمین کے مشترکہ استعمال اور اجتماعی محنت'' شروع کرنے کا فلسفہ پیش کیا گیا۔

یہ ''حقیقی ہموار کرنے والے نام نہاد آئین و قانون کے اندر رہتے ہوئے'' کام کر رہے تھے۔ دوسری خام خیالی یہ تھی کہ وہ ''ذاتی مثال'' سے لوگوں کو متاثر کر کے انہیں اپنے فلسفے کا ہمنوا بنا پائیں گے۔ یعنی عمل کے ذریعے پروپیگنڈہ۔ اور یہ کوئی غلطی نہ تھی بلکہ اُس زمانے کا معروض ایسا تھا۔

آٹھ اپریل 1649 میں دو درجن افراد ''کھدائی کرنے والوں'' کے بطور نکلے اور کھیتوں میں اجتماعی کام اور اجتماعی پیداوار کے اپنے فلسفے کو عملی جامہ پہنانے لگے۔ گو کہ یہ غیر ضرررساں لوگ تھے۔ اپنے کام میں مگن۔ ان کا کسی سے کچھ لینا دینا نہ تھا۔ مگر جائیداد والوں کو اُن سے ایٹم بم سا خطرہ محسوس ہوا۔ جائیداد کی ملکیت کے سوال کے بارے میں جائیداد والوں کی حساسیت تو خدا کی پناہ!!۔ یہ طبقہ اہل وعیال سے بھی زیادہ جائیداد کو عزیز رکھتا ہے۔ چنانچہ سارا دولتمند طبقہ اِن چوبیس افراد کے خلاف ہو گیا۔ جولائی 1649 میں ان پر مقدمے قائم کیے۔ مقامی جاگیردار مقدمہ قائم کرتے ہیں، عدالتیں اُن کے مقدمے کی پذیرائی کرتی ہیں اور ''ملکیت کا قانون توڑنے'' کے الزام میں ونسٹین لے اور اس کے دو کامریڈوں پر اتنا بڑا جرمانہ عائد کیا گیا کہ وہ ''ہموار کرنے والوں'' کی ملکیت کی مجموعی قیمت سے زیادہ تھا۔ جرمانے کی عدم ادائیگی کی صورت میں انہیں زبردستی زمین سے بے دخل کیا جانا تھا۔

اُدھر سے بے دخل یہ لوگ کہیں اور منتقل ہو گئے مگر وہاں بھی مقامی جاگیردار سے لے کر پارلیمنٹ تک اُن کے دشمن موجود تھے جنہیں خوف تھا کہ ان گنے چنے افراد کی کامیابی دیہات میں سوشلسٹ انقلاب لائے گی۔

اِدھر ونسٹین لے بھی خاموش نہ تھا۔ اس نے ایک اور پمفلٹ سے بمباری کر دی: ''انگلینڈ کے غریب اور استحصال زدہ لوگوں کی طرف سے ایک اعلان نامہ''۔ اس میں انگلینڈ میں پڑی بے کار اور عوامی زمینوں کو آباد کرنے اور اجتماعی آمدن کو حق بجانب ثابت کیا گیا۔ اور دوسروں کی محنت پر عیاشی کرنے والے جاگیرداروں کی مذمت کی گئی۔

ونسٹینلے کی دوسری تصانیف بھی نمودار ہوئیں:

''ولیم سٹاراور جان آف والٹن کا غیر مسیحی کام اور بلاؤڈی کا اعلان نامہ''،''میرے لارڈ جنرل اوراس کی جنگی کونسل کے نام''،''ہاؤس آف کامنز کو اپیل''،''لندن کے شہر اور فوج کو پیغام''۔

ان پمفلٹوں میں وہ حکمرانوں پر الزام لگاتا ہے کہ وہ ''لیولرز'' کو غیر قانونی سزائیں دے رہے ہیں، ایذائیں پہنچا رہے ہیں، اُن کے گھروں کو مسمار کر رہے ہیں اور اُن کی مشترکہ محنت کو تباہ و برباد کر رہے ہیں۔ جب ونسٹینلے کو احساس ہوا کہ پارلیمنٹ نجی ملکیت والوں کی محافظ ہے اور اس سے اپیل کرنا بیکار ہے تو اس نے اگست 1649 کو براہِ راست لوگوں اور فوجیوں سے اپیل کر دی: ''لندن شہر اور فوج کو پیغام''۔ اس نے اس پمفلٹ میں پارلیمنٹ کے عوام دشمن اقدامات اور جاگیرداروں کا تحفظ کرنے کی تفصیلات بتائیں۔ غریب اور امیر کے درمیان تضاد اور جدوجہد کی تصویر کشی کی۔

مگر اس کی ساری کوششیں رائیگاں گئیں۔ اور نومبر 1649 کو لیولرز کی کمیون پر فوجی حملہ ہوا۔ سپاہیوں کا ایک دستہ سینٹ جارج کی پہاڑی پر نمودار ہوا۔ اس نے لیولرز کے گھر تباہ کر دیے۔ مارکس اور اینگلز نے انہیں ''انقلابی شہید'' لکھا۔

مگر حق و انصاف کی تحریک کو تھکاوٹ نہیں ہوتی۔ ونسٹین لے 1652 میں ایک اور تصنیف کے ساتھ سامنے آیا: ''آزادی کا قانون''۔

اس میں اس نے انگلستان میں بہت جلد، ایک ایسے سماج کے قیام کی پیشن گوئی کر دی جس میں ملکیت کے بارے میں انصاف ہوگا۔ زمین بھی مشترک ہوگی، اس پر محنت بھی مشترک کی جائے گی اور پیداوار بھی مشترک ہوگی۔ اُس نے اس سماج کے قیام میں کسی جنگ، جدل اور جدوجہد کو خارج ازامکان قرار دیا۔ اس یوٹوپیائی عظیم شخص نے شاہ عنایت، تھامس مور اور کمپنیلا کی طرح ذاتی مثال سے جاگیرداروں کو قائل کرنا چاہا کہ وہ ظلم کر رہے ہیں اور لہٰذا ''وہ رضاکارانہ طور پر ظلم (نجی جائیداد) سے دستبردار ہو جائیں گے اور کمیونزم نافذ ہو جائے گا''۔

شریف آدمی نے بادشاہ کو پھانسی دینے والے پارلیمنٹ کے مالک کراموئیل سے مطالبہ کیا کہ وہ ساری زمین غریبوں میں تقسیم کر دے۔ کمیونزم کا مطالبہ سرمایہ دار سے!!

ذرا دیکھیے تو:

''بہ خدمت اولیور کراموئیل

جناب عالیٰ!

''خدا نے آپ کو وہ عزت بخشی ہے جو (حضرت) موسیٰ کے بعد کسی کو نہ بخشی۔ یعنی اُس نے آپ کو اُن عوام کا سربراہ بنایا جنہوں نے ایک ظالم فرعون کو نکال باہر کر دیا۔ اس لئے کہ جب نارمن قوت نے ہمارے آباؤ اجداد پر قابو پالیا تو اس نے ہم انگریزوں کی زمین کو ہمارے آبا سے چھین کر استعمال کیا اور ہمارے اجداد کو اپنا نوکر بنا دیا۔ اب خدا نے آپ کو اُس فاتح کو نکال باہر کرنے اور ہماری زمین اور آزادیاں لوٹانے کے لئے ایک کامیاب ذریعہ بنایا۔

''اور اب زمین کی قوت آپ کے ہاتھ میں ہے۔ زمین مظلوم عوام الناس کو دیجئے جنہوں نے آپ کی مدد کی اور فوج کو اس کی تنخواہیں دیں............''۔

یہ تصنیف مستقبل کے سماج کی تشریح کرتی ہے۔ ابدی مساوات کا سماج اور محنت کی عظمت کا سماج۔ جہاں نجی ملکیت نہ ہوگی اور کاروبارِ مملکت عوام کی مرضی سے چلایا جائے گا۔

مگر، صنعتی مزدور (پرولتاریہ) نہ ہو تو ایسے خیالی تصورات پیش ہوتے ہی رہتے ہیں۔

لیولرز اور ڈگرز جائیداد اور مراعات والے انگلینڈ سے نفرت کرتے تھے۔ وہ اصولی ریپبلکن تھے جنہوں نے کروم ویل کی اُس وقت حمایت کی جب اُس نے بادشاہ چارلس یکم کو پھانسی دینے کا فیصلہ کیا۔ مگر یہی کروموئیل زمین کے مالکوں اور تاجروں کے مفادات کی ہر وقت حفاظت کرتا رہا۔

اس نے "The Diggers song" نام کا کسانوں کا ایک ترانہ بھی لکھا تھا۔ اس تحریک کے اثرات مشہور انگریز شاعر جان ملٹن پر بھی بہت گہرے اور دُور رس ہیں۔ اس کی شہکار نظم ''Paradise Lost'' اس دور کی سماجی و سیاسی تحریکوں، (جن میں بادشاہت کے خلاف لیولرز کی جمہوری تحریک شامل ہے) کی عکاسی کرتی ہے۔ اور شاعر جمہوری قوتوں کا طرفدار اور حامی ہے اور ملوکیت کا دشمن۔

1652 کے بعد ونسٹن لے کے بارے میں کوئی معلومات موجود نہیں ہیں۔ یہی سمجھا جاتا

ہے کہ وہ اسی سال گمنامی میں فوت ہوا ہوگا۔ اُس کے نظریات اُس زمانے کے پس منظر میں واقعتاً بہت نجیب و شریف و پاک تھے۔ بلند انسانی آدرشیں!!

ریفرنس

1۔ رابرٹ سروس۔ کامریڈز۔ 2007۔ میکملن صفحہ 16

تھامس مور

(1535۔۔۔۔۔1478)

تھامس مور کا نام عام بات چیت میں اکثر سننے میں آتا ہے۔ یہ گفتگو خواہ سیاست پہ ہو رہی ہو یا فلسفہ اور معیشت پہ، تھامس مور، اور یوٹوپیا سمجھو ہر زبان پہ ہیں۔ پندرھویں صدی کا یہ مدبر، سات فروری 1478 کو لندن میں پیدا ہوا۔ ایک شاہی جج 'سر جان مور کے گھر۔ وہ تو بہت بعد میں چرچ نے اُسے بزرگ یعنی سینٹ کا لقب دے کر اُسے اپنے مذہبی بڑوں میں بھرتی کر لیا: سینٹ تھامس مور۔ یہ بھی عجب ادارہ رہا ہے۔ پہلے مجرم قرار دے کر قتل کر ڈالتا ہے اور موت کے بعد پھر اُسے ''سینٹ'' قرار دیتا ہے۔

چونکہ اُس زمانے میں شاہی جج کا عہدہ موروثی ہوا کرتا تھا' اس لئے تھامس مور کو بھی بڑا ہو کر جج ہی بننا تھا۔

اس نے عمدہ تعلیم حاصل کی اس لئے کہ مہربان فطرت نے اُس کو بہترین استاد میسر کر دیئے۔ والد نے اسے آکسفورڈ یونیورسٹی بھیجا جہاں دو سال میں اس نے لاطینی، یونانی، ادب، علم بلاغت اور منطق کا مطالعہ کیا۔ وہیں آکسفورڈ میں اس کی دوستیاں ایک زبردست انسانیت دوست گروپ کے ساتھ جُڑ گئیں۔ وہ ایسے عالم و فاضل لوگ تھے جنہیں علمی خودنمائی سخت ناپسند تھی۔

مگر ہر باپ کی طرح تھامس مور کے والد کو بیٹے کی یہ وابستگی پسند نہ تھی۔ چنانچہ اس نے اُس کی غلط صحبت دیکھ کر اُسے آکسفورڈ سے واپس لندن بلا لیا۔ وہاں اس نے علمِ قانون پڑھا اور 1502 میں ایک قانون دان بن گیا۔

اسی دوران روٹرڈم کے مشہور عالم ایراسمس کے ساتھ اس کی دوستی ہوگئی تھی۔ یہ دونوں عالم چرچ کی اخلاقی تطہیر اور قدیم ادب کا مطالعہ کرنے لگے۔ مور تیزی کے ساتھ ذہنی ترقی کے مدارج طے کرتا رہا اور بہت جلد وہ انگلستان کی انسانیت پسندی کی تاریخ کا مرکزی شخص بن گیا۔ اسی کے گھر میں اور اسی کے تعاون سے ایراسمس نے اپنی مشہور کتاب لکھی جس کا نام تھا: ''طاقت کی توصیف میں''۔

ہمارا یہ وکیل دلچسپ شخص تھا۔ وہ پیسے کے پیچھے کبھی نہ بھاگا۔ بلکہ وہ تو الٹا اپنی آمدنی سے غریبوں کی مدد کرتا تھا۔

بعد ازاں وہ لندن میں کئی برس تک ایک محنتی اور ایماندار جج کے بطور کام کرتا رہا۔ وہ شہر بھر میں غریبوں کا محافظ بن گیا۔

اُس نے اتنا وقار، اتنی عزت اور اتنی مقبولیت کمائی کہ 1504 میں وہ پارلیمنٹ یعنی ''ہاؤس آف کامنز'' کا ممبر منتخب ہوگیا۔ مگر ظاہر ہے کہ بہت جلد بادشاہ، ہنری ہشتم کے عزائم سے اس کا تصادم ہوگیا۔ دلچسپ واقعہ یہ ہوا کہ ملک کے بادشاہ نے ہاؤس آف کامنز سے مطالبہ کیا کہ وہ اس کے بڑے شہزادے آرتھر کی بہادری کے صلے میں اُس کے لیے وظیفہ مقرر کرے۔ مگر تھامس مور تو غضب ناک ہوگیا۔ ایسی ناجائز بات پہ اُس باضمیر شخص کو غضب ناک تو ہونا ہی تھا۔ اس نے ایک پر مغز و مدلل تقریر کر کے اِس مطالبے کو مسترد کروا دیا۔ بادشاہ کے طیش کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ (اگر آپ بلوچ ہیں تو اپنے سردار کے خلاف ایسی تقریر کر کے دکھائیں؟)۔

ہمارے سردار سے ہزار گنا زیادہ طاقتور بادشاہ طیش میں ہو تو پھر سفاک انتقام لیتا ہے۔

چنانچہ بادشاہ نے تھامس مور کو پارلیمنٹ سے برطرف کر دیا۔ اس کے والد کو قلعے میں بند کر دیا اور رہائی کے لئے معاوضہ طلب کیا۔ تھامس مور کو بادشاہ کے غصے کی گہرائی اور گیرائی کا اندازہ تھا۔ چنانچہ اس نے خیر اس میں پائی کہ وہ فرار ہوگیا اور عارضی طور پر ایک خانقاہ میں پناہ لی۔

اس دوران بادشاہ ہنری مرگیا۔ اُس کی موت قوم کی حیات بن گئی یا نہیں، مگر یہ ضرور ہوا کہ تھامس مور 1510 میں دوبارہ پارلیمنٹ میں منتخب ہو سکا۔ اور اُسی سال اُسے لندن شہر کے شیرف کا اسسٹنٹ متعین کیا گیا۔ محنتی آدمی تھا، انسان دوست شخص تھا، اس لیے اس نے کچھ ہی عرصے میں شہریوں کے دل موہ لیے۔

اگلے سال یعنی 1511 میں اس کی بیوی ''جین'' کا انتقال ہوگیا۔ ان سے اس کے چار بچے تھے۔ تب مور نے ایک بیوہ سے دوسری شادی کی۔ جس سے اس کی کوئی اولاد نہ ہوئی۔ مور نے اپنی اولاد بالخصوص بیٹیوں کو اعلیٰ تعلیم دلائی جو کہ اُس زمانے میں ہمارے آج کے زمانے کی طرح، ایک غیر رواجی اور غیر معمولی بات تھی۔ مور عورتوں کی تعلیم کا بہت بڑا طرفدار تھا۔

1512 سے لے کر 1518 تک اس نے ''شاہ رچرڈ سوئم کی تاریخ'' نامی کتاب لکھنے پر کام کیا۔ 1515 میں اس نے فلانڈرز نامی علاقے کا سفر کیا۔ اور وہاں نہ صرف بڑے عالموں سے ملاقاتیں کیں بلکہ وطن سے دور اپنی مشہور زمانہ کتاب ''یوٹوپیا'' پر کام بھی شروع کیا۔ دنیا بھر میں مشہور ہونے والی یہ کتاب 3 ستمبر 1516 میں چھپی۔ اس وقت مور کی عمر 37 سال تھی۔

اس کتاب کے دو حصے تھے۔ پہلا حصہ سولہویں صدی کے آغاز میں انگلستان کے سماجی نظام کو مسترد کرتا ہے جو ظلم، لوٹ، استحصال، ناانصافی اور عدم مساوات پہ کھڑا ہے۔ اور دوسرے حصے میں اس کی جگہ پر ایک بہتر ریاستی نظام پیش کیا گیا ہے جو فرضی طور پر ''یوٹوپیا'' کے جزیرے میں قائم ہے۔

''یوٹوپیا'' نامی یہ کتاب لاطینی زبان میں مکالمے کی صورت میں لکھی گئی ہے۔ یہ دراصل ایک ناول ہے۔ اس میں ایک افسانوی کردار رافیل ہتھلوڈے ہے۔ وہ فرضی جزیرے ''یوٹوپیا'' کے بارے میں ایک فرضی قصہ سناتا ہے جہاں اس نے فرضی طور پر پانچ سال گزارے۔ اس یونانی لفظ ''یوٹوپیا'' کا مطلب ہے ''کہیں نہیں''۔ اور اس نے اس جزیرے کو صرف اس لئے چھوڑ دیا تاکہ انسانوں کو اس نئی دنیا اور اس کے مکینوں کے بارے میں بتائے جنھوں نے ایک منصفانہ سماجی نظام قائم کر رکھا تھا۔

مور نے یہ کتاب ایسے انگلستان کے پس منظر میں لکھی جہاں پندرہویں صدی کے اواخر میں پشم کی زبردست مانگ پیدا ہوئی۔ جس نے لوگوں کو زراعت کے بجائے مویشی بانی پر مجبور کیا

اور یوں بڑے بڑے جاگیردار اب بڑے بڑے ریوڑوں کے مالک بن گئے تھے۔ چراگاہوں کی ضرورت نے اِن جاگیرداروں کو لوگوں کی چراگاہوں پر قبضہ کی طرف راغب کیا جہاں پھر عام کسان اپنے ریوڑ نہیں چرا سکتے تھے۔

یہ بے روزگار کردہ ہزاروں کسان دربدر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور ہوئے۔ اُدھر ریاست انہیں آوارہ گرد اور بھکاری گرداننے لگی جن کے لئے سخت ترین سزائیں مقرر تھیں۔ اگر وہ پہلی بار پکڑا جائے تو اُس کو چھکڑوں سے باندھ کر لہولہان ہوجانے تک پیٹا جاسکتا تھا۔ اگر دوسری بار آوارہ گردی میں پکڑا جاتا تو اُس کا آدھا کان کاٹا جاسکتا تھا اور تیسری بار پکڑا جاتا تو اُس بھکاری کی سزا موت ہوتی تھی۔

ہر سال ہزاروں کسان ان سزاؤں کے مرتکب ہونے لگے۔ مگر خالی اور بھوکا پیٹ کسی سزا جزا کو نہیں مانتا۔ چنانچہ ایسی غیر انسانی سزاؤں کے باوجود بے روزگاری ہر سال ہزاروں نئے آوارہ گرد پیدا کرتی جاتی تھی۔

تھامس مور نے بہت غور کیا، بہت مغز ماری کی۔ بالآخر اسے اس ساری ابتری کی وجہ اور اس ساری غیر انسانی صورتِ حال کا ذمہ دار، ذاتی ملکیت نظر آیا۔ اس کی نظر میں ہر سماجی برائی ذاتی ملکیت کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے اور پروان چڑھتی ہے۔ اُسے اس کا حل بھی مل گیا۔ اس نے دنیا کو وہ بہت خوبصورت فقرہ دیا جو سات صدیاں گزرنے کے باوجود آج بھی واحد حل ہے انتہا پسندی، دہشت گردی اور جنگوں کا: ''اس صورتحال کی ''وجہ'' کے خلاف جنگ کی جائے نہ کہ اس کے ''شکار'' لوگوں کے خلاف''۔

اس نے اسی نظریے کے تحت ''یوٹوپیا'' لکھا۔

اُس کے اِس جزیرے میں ہر آدمی کام کرتا ہے، ہر شخص انسان کی عمومی بہتری اور اجتماعیت کے بارے میں سوچتا ہے۔ وہاں ذاتی ملکیت موجود نہیں ہے بلکہ دولت اجتماعی ہوتی ہے۔ خوراک غیر مساوی تقسیم نہیں ہوتی۔ ساری زمین مشترک ہے۔ ریاست پیداوار کو برابر تقسیم کرنے کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ اور ریاست ہی بیرونی تجارت کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ زائد پیداوار دوسرے ممالک کو برآمد کی جاتی ہے مگر اس کا ساتواں حصہ وہاں کے غریب لوگوں میں مفت تقسیم کیا جاتا ہے اور باقی کو کم قیمت پر فروخت کیا جاتا ہے۔

یوٹو پیا کا ہر شہری اپنے اپنے کام کے ساتھ ساتھ زرعی شعبے میں بھی لازماً کام کرتا تھا۔ عورتیں مردوں کے ساتھ برابری کی بنیاد پر کام کرتی تھیں۔ چھ گھنٹے یومیہ کام ایک خوشحال سماج کے لئے کافی تھا۔ وہاں مردوں اور عورتوں کو یکساں تعلیم دی جاتی تھی۔

اُس کے یوٹوپیا والے سماج میں غلامی بھی موجود تھی۔ بس فرق یہ ہے کہ یہ غلامی موروثی نہ تھی۔ بلکہ یہاں غلام' وہ لوگ ہوتے تھے جو جرائم پیشہ، یا تاحیات قیدِ مشقت پانے والے افراد، اور یا پھر جنگی قیدی ہوتے تھے۔

یہاں مکان اور باغات عوامی ملکیت میں تھے اور ہر دس سال بعد اُن کی دوبارہ تقسیم قرعہ اندازی کے ذریعے کی جاتی تھی۔

ہم سب کی طرح، تھامس مور شروع میں بادشاہ کی اصلیت کو سمجھ نہ سکا اور اس کی تعریفیں کرنے لگا۔ بہت عرصہ بعد کہیں جاکر اُسے بادشاہ (اور بادشاہت) کی اصلیت معلوم ہوئی۔ ایماندار آدمی تھا۔ انجانے میں عالم فاضل تھامس مور انگلستان کی اعلیٰ ترین شخصیتوں میں سے ایک بن چکا تھا۔ بادشاہ نے اُس سے دوستی گانٹھ لی اور اسے دربار میں ملازمت دی۔ کامیابیاں حاصل کرتے کرتے مور 1518 میں شاہی کونسل کا ممبر بن گیا۔

شریف آدمی بادشاہ کے نام آئی ہوئی درخواستیں پڑھتا تھا۔ اُن کے متن سے بادشاہ کو آگاہ کرتا اور فیصلے کے مشورے دیتا تھا۔ (ایسے کتنے کیریکٹر ہمارے ہر قبیلے اور قبیلے کے بادشاہ میں موجود ہیں!!)۔

مئی 1521 میں وہ خزانے کا اسسٹنٹ مقرر ہوا۔ یوں وہ سفارتی دوروں میں حصہ لینے لگا۔ 1523 میں وہ دارالعوام کا سپیکر بن گیا۔ ایسا قابل شخص کہ 1525 میں اسے لنکاسٹر کی ریاست کے چانسلر کے عہدے پر مامور کیا گیا۔ 1529 میں اُسے انگلینڈ کے لارڈ چانسلر کا عظیم عہدہ دیا گیا۔ اس نے یہ عہدہ بہت ہی اعلیٰ اخلاقی معیار اور قابلیت سے چلایا۔

مور بہت ہی خدا پرست انسان تھا۔ وہ کیتھولک مذہب سے تعلق رکھتا تھا۔اس زمانے میں اصلاحِ کلیسیا کی تحریک شروع ہوچکی تھی۔مگر چرچ کا ناقد ہونے کے باوجود اس نے اس نئی تحریک کی مخالفت کی۔اصلاح پسند مارٹن لوتھر نے 1520 میں یکے بعد دیگرے تین کتابیں لکھیں۔ جن میں اس نے رومن کیتھولک چرچ کی زیادتیوں اور مظالم کے خلاف لکھا۔بادشاہ ہنری ہشتم نے مور کی مدد سے لوتھر کا جواب دیا۔اچھا بھلا استعمال ہوا یہ نفیس انسان۔یہ اس قدر اچھا جواب تھا کہ اس پر روم میں متمکن پوپ نے بادشاہ کو ''عقیدے کا دفاع کنندہ'' کا خطاب دیا۔لوتھر نے بادشاہ کے خلاف کتاب لکھ کر اسے ''سؤر، احمق اور جھوٹا'' کہہ دیا۔بادشاہ نے مور سے لوتھر کا جواب لکھنے کی درخواست کی۔کچھ عرصہ بعد اس کی کتاب ''لوتھر کے خلاف ہنری کی حمایت'' چھپی جس میں اس نے بادشاہ ہنری کی زبردست حمایت کی۔ہر حد پار کرتے ہوئے اس نے پوپ کی بھی حمایت کی اور لوتھر والی درشت زبان استعمال کرتے ہوئے جواباً اُسے ''بندر، شرابی اور چھوٹا سست فرقہ پرست'' لکھا۔1528 میں اس نے ایک کتاب لکھی جس میں اس نے پھر کیتھولک چرچ کی حمایت کی۔ 1929 میں اس نے پھر ایک کتاب لکھی۔1531 میں جب ولیم ٹنڈیل نے تھامس مور کی ایک پچھلی کتاب کا جواب لکھا تو مور نے پانچ لاکھ الفاظ پر مشتمل اس کا جواب لکھا۔

پٹڑی سے اترے ہوئے مور کی یہ ساری تصانیف پروٹسٹنٹ عقیدے کے خلاف تھیں اور لوتھر کی مخالفت میں تھیں۔یہ ساری کتابیں پوپ اور کیتھولک عقیدے کے حق میں تھیں۔

مگر بادشاہ تو بادشاہ ہوتا ہے۔اس بادشاہ نے بھی جلد ہی ہوا کا رخ دیکھ لیا اور وہ اپنے پچھلے موقف کے عین برعکس، کلیسیاء کی اصلاح کی طرفداری کرنے لگا۔ہم مزدک کا حشر تاریخ میں دیکھ چکے ہیں مگر مزدک کا کمال یہ تھا کہ اُس نے اپنا موقف نہ بدلا، بلکہ بادشاہ اس کے موقف کے ساتھ مل گیا۔

یہاں تھامس مور کے بادشاہ کے اس پورے عمل کے پیچھے ایک اور وجہ تھی۔دراصل وہ اپنی پہلی بیوی (ہسپانوی شہزادی) کو طلاق دینا چاہتا تھا جو ہسپانیہ کے بادشاہ کی بیٹی تھی۔مگر طلاق کی تو مسیحیت میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔مور کا یہ بادشاہ این بولین نامی ایک حسین ترین دوشیزہ سے شادی کرنا چاہتا تھا۔پوپ نے اُس کی اجازت نہ دی۔پوپ کوئی خاص اصول والا مسیحی نہ تھا۔اس نے محض ہسپانیہ کے بادشاہ کو خوش کرنے کی خاطر ایسا کیا۔چنانچہ بادشاہ ہنری نے پوپ سے تعلقات توڑ دیئے۔سارا چرچ تتر بتر کر دیا۔اور خود ہی انگلستان کے کلیسیا کا سربراہ بن بیٹھا۔اُس نئے مولوی نے اپنی ملکہ کو طلاق دے ڈالی اور این بولین سے شادی رچالی۔

اس سارے اقدام کے نتیجے میں ایک اور اہم تبدیلی بھی آئی۔وہ یہ کہ سارے مذہبی ٹیکس، روم کے پوپ کو جانے کے بجائے خود ہنری کے خزانے میں آنے لگے۔اس کے علاوہ اس نے خانقاہوں کی جائیداد ضبط کر کے اپنے خزانے بھر دیے۔یوں دنیاوی وجوہات کی بنا پر بادشاہ نے سولہویں صدی کے کلیسیا کی اصلاحی تحریک کو قبول کر کے رائج کر دیا۔

تھامس مور نے جب یہ ساری صورتحال دیکھی تو اس کے تو پیروں تلے زمین نہ رہی۔سچا انسان تھا۔اُس سے یہ سب کچھ برداشت نہ ہوا۔اس نے تو روانی روانی میں بادشاہ کا فکری باڈی گارڈ بن کر بہت کچھ لکھا تھا۔اب بادشاہ مکر گیا اس لیے کہ اس کے پاؤں میں کوئی زنجیر نہ تھی۔تھامس مور کے ساتھ یہ صورتحال نہ تھی۔اُسے تو اپنی تحریروں کی صلیب پر چڑھنا تھا۔چنانچہ اس ستھرے اور خالص مسیحی نے سب سے پہلے تو تین سال تک لارڈ چانسلر رہنے کے بعد اپنے عہدے سے استعفیٰ دیا۔بادشاہ نے براہِ راست اس کی مخالفت نہیں کی۔بس اس کی چھوٹی سی جاگیر ضبط کی اور اُسے کچھ کیسوں میں پھنسانے کی کوشش کی۔

تھامس مور اکیلا رہ گیا۔سارے لوگوں نے ''رام بھلی کرے گا'' کہہ کر اپنی دنیا بسالی۔پارلیمنٹ نے بادشاہ کے خوف سے 1553 میں بادشاہ کو کلیسیا کا سربراہ تسلیم کیا، اس کی طلاق کو جائز قرار دیا اور شادی سے پہلے پیدا ہونے والی این بولین کی بیٹی کو تخت کی وارث تسلیم کیا۔(ضیاء الحق کا پارلیمنٹ۔سترھویں ترمیم پاس کرنے والی پاکستانی پارلیمنٹ!!)۔مور نے حلف لینے سے انکار کر دیا۔چنانچہ حسبِ توقع اُسے غدار قرار دے کر گرفتار کیا گیا۔

اُسے تاریک کوٹھری میں اذیتیں دی گئیں۔مگر اس نے اذیت ناک جیل میں ڈٹ کر چھ ماہ گزارے اور اپنے خلاف لگائے جانے والے جھوٹے الزامات کو غلط ثابت کیا۔اس نے یوٹوپیا میں

پیش کردہ اپنے نظریات سے وفاداری کی۔ اس نے اپنے نظریات سے منہ نہ موڑا۔ ججوں نے پھر بھی اسے مجرم قرار دیا (جج کیا ہوتے ہیں، انگریز کے شاہی جرگہ ممبر جو یوسف مگسی کو سزا دینے کے پابند ہوتے ہیں)۔ چنانچہ تھامس مور کو اس زمانے کی مروجہ اذیت ناک سزا سنائی: تشدد بھرا قتل۔

مور کی سابقہ خدمات کو مدنظر رکھ کر ڈرامہ بادشاہ نے تشدد سے قتل کرنے کے بجائے اُس کی موت کی سزا کو ''بس'' سر کاٹنے کی سزا میں تبدیل کر دیا۔

سزائے موت کے وقت مور نے جلاد کو گلے لگایا اور ہو بہو صوفی شاہ عنایت کے الفاظ کی طرح یوں کہا: '' تم مجھ پر وہ عظیم احسان کر رہے ہو جس کی میں کسی انسان سے خواہش کر سکتا ہوں......''۔ اس نے جلاد کو تکلیف دینے کے بجائے خود اپنی آنکھوں پر پٹی باندھی۔ ہوش و حواس قائم رکھتے ہوئے اپنی داڑھی کلہاڑی کی زد سے پرے ہٹائی اور موت کو گلے لگایا۔

عبرت کے لیے صرف یہی کافی نہ تھا۔ اسے قتل کرنا کافی نہ تھا۔ بغیر سر والی اُس کی لاش ٹاور آف لندن میں دفن کی گئی، جبکہ اس کا سر لندن برج کے اوپر ایک نیزے پر ایک ماہ کے لئے فکس کیا گیا۔ (سب سفاک لوگ باغیوں کو عبرت کا نشان ضرور بنا لیتے ہیں، کسی کے اعضا کاٹ کر مسجد کے گیٹ پر لٹکا دیے جاتے ہیں تا کہ دوسروں کو عبرت ہو، کسی کی لاش چوک پر لٹکا کر اُس کی تین تین دن تک بے حرمتی کی جاتی ہے کہ عبرت رہے' اور کچھ کو چھ ہزار کی تعداد میں کاٹو آ جانے والی سڑک کے ساتھ ساتھ لٹکا دیا جاتا ہے تا کہ عبرت رہے)۔

مگر تھامس مور نے تو طبقاتی اور غیر منصفانہ نظام کو عبرت بنا ڈالا۔ اُس کی شاندار کتاب ''یوٹوپیا'' ایک ضرب المثال بن گئی۔ ''یوٹوپیائی سوشلسٹ'' والی اصطلاح اُس کی اسی کتاب سے نکلی۔ اور وہ خود یوٹوپیائی سوشلزم کے بانیوں میں شمار ہونے لگا۔ اس یوٹوپیائی سوشلزم سے بعد میں بہت ہی شاندار نظریات کے بیج پھوٹے۔............

سینٹ سائمن

(1825ـــــ1760)

"مستقبل ہمارا ہے" سینٹ سائمن

میں حیران تھا کہ بھٹو کے دُم چھلے دانشوروں نے "اسلامی سوشلزم" کا لفظ کیسے ایجاد کرلیا؟۔اور وہ اس سے کس خوبصورتی سے کھیلتے رہے؟۔
اب جب کہ میں اس کتاب کے لیے اِدھر اُدھر سے مواد اکٹھا کر رہا تھا تو سینٹ سائمن کے ضمن میں مجھے "کرسچین سوشلزم کا بانی" ملا۔ارے، دیکھو نقالوں کو۔آپ آگے دیکھیں گے کہ کہاں بھٹو اور کہاں یہ پاک پیارے لوگ!!۔

سارے یوٹوپیائی سوشلسٹ لوگ سادہ انسان ہوا کرتے تھے۔وہ سب اپنی سادگی میں جیے، دکھ درد برداشت کیے اور سادگی کے ہاتھوں مارے گئے۔مگر سینٹ سائمن تو ایک اور وجہ سے "سادہ" تھا۔بعد میں بتاؤں گا۔

سینٹ سائمن کا پورا نام کلاڈ ڑے ہنری سینٹ سائمن تھا۔وہ 17 اکتوبر 1760 میں پیرس میں ایک ارسٹوکریٹ گھرانے میں پیدا ہوا۔اس کا باپ پولینڈ کے بادشاہ کے گارڈ کا سربراہ تھا۔یہ تو بہت بڑا عہدہ تھا۔ظاہر ہے کہ اس بچے کی تربیت مشہور عالموں نے کرنی تھی۔لہٰذا وہ نواب کے آسائشی محل میں پل بڑھ رہا تھا۔مگر تین عناصر نے اس ننھے نواب کو نظام کا باغی بنا ڈالا۔

* اس کے استاد (جین ڈی ایلمبرٹ) نے، جو کہ مشہور انسائیکلوپیڈسٹ اور سکالر تھا۔
* روشن خیالی کے نمائندوں کی تصانیف سے آشنائی نے۔اور
* آزادانہ غور وفکر کرنے کے جذبے نے۔

چنانچہ تیرہ برس کی عمر میں اس نے چرچ سے ہر طرح کی وابستگی سے انکار کردیا۔باپ تلملا اٹھا، لہٰذا اُس نے بیٹے کو اصلاح کیلئے ایک قلعے میں بند کردیا۔نوجوان نے رہائی کی کوششوں میں بالآخر جیلر کو چاقو سے زخمی کردیا اور چابیاں چھین کر فرار ہوگیا۔

سترہ برس کی عمر میں وہ فوج میں بھرتی ہوا، ایک جونیئر افسر کی حیثیت سے۔دوسال بعد وہ رضا کار کے بطور امریکہ گیا اور جارج واشنگٹن کے جھنڈے تلے برطانیہ کے خلاف امریکہ کی جنگِ آزادی میں حصہ لیا۔اور جب امریکہ آزاد ہوا تو آزاد شدہ ریاستہائے متحدہ امریکہ نے اُسے بہادری کا ایک تمغہ دیا۔مگر واپسی پر انگریزوں نے جنگِ آزادی کے اِس مجاہد کو گرفتار کیا اور جمیکا بھیج دیا۔وہ 1784 میں واپس فرانس لوٹا جہاں اسے رجمنٹ کمانڈر بنادیا گیا۔

سینٹ سائمن امریکی انقلاب میں سے گزر کر آیا تھا۔وہ اس زمانے کی روشن خیال تحریک "انسائیکلوپیڈسٹ" کے زیر اثر تھا۔اس نے فرانس میں 1789 کے واقعات کا زبردست خیر

مقدم کیا۔ وہ رضا کارانہ طور پر اپنے اعزاز سے دستبردار ہوگیا اور اپنا نام ''سادہ آدمی'' رکھ لیا۔ یہ انتخاب سادہ نہ تھا۔ اصل میں فرانسیسی کسان کو ''سادہ آدمی'' کہا جاتا تھا۔ سینٹ سائمن نے یہ نام اختیار کر کے انقلابِ فرانس کے اصل اسباب پہ زور دینا چاہا۔ وہ دو سال تک دیہات میں کسانوں کے درمیان رہا۔

مگر انقلابِ فرانس (بعد کے بے شمار انقلابوں کی طرح) اس کی سوچ اور اس کی مرضی کے مطابق نہ چلا بلکہ بڑی بورژوازی کو اقتدار دے کر انقلابِ فرانس چپ ہو کر ایک طرف بیٹھ گیا۔ مگر سینٹ سائمن تو خاموش نہیں ہوسکتا تھا۔ اس لئے وہ خاموش نہ ہوا۔ اس نے تو کسان حتمی انقلاب کی تمنا کی تھی۔ چنانچہ اس نے 1791 میں شاہ پرستوں اور گرجا کی زمین خریدنی شروع کردی۔ اس نے اُس زمین کے چھوٹے چھوٹے پلاٹ بنائے اور ضرورت مند کسانوں کو فروخت کرنا شروع کر دیا۔ (اُس زمانے میں یہی کچھ سوچا جاسکتا تھا)۔

اُسے اچھا خاصا پیسہ ہاتھ آیا، کاروبار خوب چل رہا تھا۔ اس کاروبار میں ایک ہسپانوی واقف کار بیرن ریڈرن شریک تھا۔ مگر جیکو بن آمریت نے اس لکھ پتی کو لگزمبرگ جیل کے تہہ خانے میں پھینچ دیا۔ اس کا تو سر قلم کیا جاتا اگر ''تھریڈور'' انقلاب دشمن ابھار نہ ہوتا۔ اس نے ایک سال جیل کاٹی۔ باہر نکلا تو پھر وہی کاروبار شروع کیا۔

جولائی 1796 میں سیٹ سائمن اور ریڈرن کا مشترکہ سرمایہ نصف کروڑ فرانک تک پہنچ گیا تھا۔ اس کا شریک بہت چالاک تھا۔ وہ گرفتار ہونے سے بچ گیا تھا اور بیرون ملک بھاگ گیا تھا ۔ پیرس واپس آکر اس نے ساری دولت پر دعویٰ کر دیا اور ہمارے ''سادہ آدمی'' کے پاس محض ڈیڑھ لاکھ فرانک رہ گئے۔ یہ اس کے لیے دوسرا بڑا دھچکا تھا۔ پہلا دھچکا تو انقلاب فرانس کے مایوس کن نتائج تھے جس نے ایک طرح کی لوٹ مار کی جگہ دوسری قسم کا استحصال جاری کر دیا تھا۔ سینٹ سائمن کو اندازہ ہوگیا کہ اُس کے پرانے طریقوں سے عالمی ہم آہنگی کا حصول ناممکن ہے۔

اس نے سب کچھ چھوڑ کر انسانی سماجی سائنس کی تحقیق کرنے کی ٹھان لی۔ اس نے کئی سال یورپ کے سفر پر لگا دیے جہاں وہ مشہور سائنس دانوں کے لیکچر سنتا رہا، مسلسل مطالعہ کرتا رہا اور تجربات کرتا رہا۔ 1803 میں اس کی پہلی کتاب ''اپنے ہم عصروں کے نام جنیوا کے ایک باسی کے خطوط'' چھپی۔ اس نے اس کتاب میں سماجی نظام کے لیے سائنس دانوں کو ملّا کی جگہ لینے کی تجویز دی۔ اس میں بھی وہ سماج کی از سر نو تشکیل کرنا چاہتا تھا اور ظاہر ہے کہ یوٹوپیائی طرز پر ایسا کرنا چاہتا تھا۔ انہی خطوط میں تو اس کا بہترین فقرہ چھپا ہے: ''سارے انسانوں کو کام کرنا چاہیئے''۔

سینٹ سائمن نے تاریخ کا مطالعہ کر کے نتیجہ نکالا کہ سماج میں باری باری توازن اور توڑ پھوڑ کے عرصے آتے ہیں۔ اس کا خیال تھا کہ ازمنہ وسطیٰ توازن کا ایک عرصہ تھا۔ ریفارمیشن اور انقلاب توڑ پھوڑ کا زمانہ تھا۔ اب سماج توازن کے ایک نئے زمانے کے لیے تیار ہے۔ اب ساری دنیا کو سائنسی طور پر منظّم کرنا چاہیے، اور ظاہر ہے کہ یہ صنعتی معاملہ تھا۔ انقلاب کی پرانی سیاست کا سماجی حقائق سے کوئی تعلق نہیں تھا اور نپولین کے ڈکٹیٹرشپ کا سماج کی ضروریات سے کوئی تعلق نہ تھا ۔ نپولین نے perpetual جنگ اور فتح کو سماج کا مقصد گردانا جبکہ اس سماج کے اصل مقاصد پیداوار اور کنزمپشن تھے۔

سینٹ سائن کا خیال تھا کہ دنیا کو سائنس دانوں کے ہاتھ میں دینا چاہیے، صنعتی کپتانوں کے ہاتھ میں، آرٹسٹوں کے ساتھ ہیں۔

سینٹ سائمن نے سماج کو تین حصوں میں بانٹا: Sarants، جائیداد والے اور بے جائیداد Savants کے ''روحانی طاقت استعمال کرنی تھی۔ اور سپریم باڈی کے personnal سپلائی کرنی تھی، جسے ''کونسل آف نیوٹن'' کہا جانا تھا۔ اس لیے کہ سینٹ سائمن کے تئیں خدا نے اپنے ساتھ بٹھانے اور انسانیت کو خدا کے purposes منتقل کرنے کے لیے پوپ کو نہیں بلکہ نیوٹن کو منتخب کیا تھا۔ اس کونسل کو تین ریاضی دانوں، تین فزیشنوں، تین کیسٹوں، تین فزیالوجسٹوں، تین litteratures، تین پینٹروں اور تین موسیقاروں پر مشتمل ہونا تھا۔ اس کونسل کو خود کو انسانیت کی عمومی بہتری کے لیے نئی ایجادات اور آرٹ کے نمونوں کی ایجاد پر وقف کرنا تھا۔ ''کونسل آف نیوٹن'' کی تنخواہیں عمومی چندے سے ادا کی جائیں، اس لیے کہ یہ ہر آدمی کے فائدے میں تھا کہ انسانی تقدیریں کو جی نی پیس افراد کنٹرول کریں۔ یہ چندہ انٹرنیشنل ہوگا اس لیے کہ یہ بین الاقوامی جنگوں کو

روک کر ساری اقوام کے فائدے میں ہوگا۔

البتہ، گورننگ سماج کے اُن ممبرز نے کرنی تھی جن کے پاس زندہ رہنے کے لیے کافی آمدن ہوتی اور جو بغیر تنخواہ کے ریاست کے لیے کام کریں۔ بے جائیدادوں کو اسے تسلیم کرنا ہے اس لیے کہ یہ اُن کے بہترین مفاد میں ہے۔ جس وقت انقلاب کے دوران انہوں نے معاملات اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کی تھی، تو انہوں نے اسے خوفناک گڈ مڈ بنا دیا تھا اور خود کو قحط میں ڈال دیا تھا۔

حکومت کے چار حصے ہونے تھے: فرنچ، انگلش، جرمن اور اٹالین۔ اور بقیہ دنیا کے باشندوں کو، جنہیں سینٹ سائمن کمتر گردانتا تھا، کو کوئی اور jurisdiction تعویض کرنا تھا۔

صفحہ 82،83

1805 میں اس کا سارا پیسہ ختم ہو چکا تھا۔ وہ ایک نواب کے پاس یہ درخواست لے کر پہنچا کہ اُسے کوئی ملازمت دی جائے۔ اس نواب نے اسے پیرس کی ایک دکان میں منشی لگوا دیا۔ جہاں وہ دن میں نو گھنٹے کام کرتا تھا۔ اس دوران وہ اپنا سائنسی کام بھی جاری رکھے ہوئے تھا۔

اس کے سابقہ نوکر ڈایارڈ نے اپنے خرچے پر اُس کی دوسری کتاب ''انیسویں صدی کے سائنسی کارناموں کا تعارف'' چھپوادی۔ ایسا 1808 میں ہوا۔

ڈایارڈ جلد ہی مر گیا اور سینٹ سائمن پھر غریب ہو گیا۔ سوکھی روٹی کے لئے بھی، اسے اپنے گھر کی چیزیں تک بیچنی پڑیں۔ وہ تنگدستی میں مزید جذبے کے ساتھ کام کرتا۔ اور اس نے بہت ہی سنجیدہ تصانیف تخلیق کیں۔ مثلاً ''عالمی کشمکش پر تحقیق'' اور ''انسانی سائنس پر ایک مضمون''۔ اس کے علاوہ L,Industrie اور Organisate نامی دو اور کتابیں بھی لکھیں۔ 1821 میں اس نے ''صنعتی نظام پر ایک مضمون'' نام کی ایک کتاب لکھی۔ وہ فرانسیسی انقلاب، اس کے اسباب اور نتائج کو موضوع بناتا رہا۔ وہ بحران کے اصل اسباب پر بات کرتا ہے اور انقلابِ فرانس کی اصل منزل (سوشلزم) کی بجائے ایک اور افسوس ناک حالت تک پہنچنے کی وجوہات بیان کرتا ہے۔ وہ اس انقلاب کو اس حالت سے نکالنے کے اقدامات پر بھی غور کرتا ہے۔

''بادشاہ کو خطاب'' میں سائمن نے اخلاقی اور سیاسی خرابیوں کی تشریح یوں کی کہ پرانا نظام تباہ ہو گیا، نیا آیا نہیں۔ حل یہ ہے کہ بڑی تیزی اور توانائی سے نئے نظام کی تنظیم کی جائے۔ اس نے بادشاہ کو مشورہ دیا کہ وہ اشرافیہ کو ختم کرے، اور صنعت کاروں کو سیاسی امور میں حصہ دار بنائے۔ (بادشاہ کو مشورہ؟۔ یار یہ کیا بیماری ہے جو اس قدر ڈھیٹ اور دیر پا رہتی ہے۔ اٹھارویں صدی میں بھی یہ بیماری موجود تھی اور عام آدمی میں نہیں، سینٹ سائمن جیسے پاک انسان میں۔ اور اکیسویں صدی میں بھی جہاں بلوچستان میں انقلابی لوگ سردار کو مشورے دے رہے ہوتے ہیں، پیپلز پارٹی کے انقلابی آصف زرداری کو، اور ''ن'' کے انقلابی نواز شریف کو انقلاب لانے کے مشورے دے رہے ہوتے ہیں.......... بڑی ڈھٹائی کے ساتھ۔ دانشوروں کی لیڈروں کو مشورہ گیری مردہ باد!!)۔

''عوام دوستوں کو خطاب'' میں اس نے اعلان کیا کہ تعلیمی ترقی سے پیدا شدہ بحران کا ایک ہی حل ہے: ملٹری، پیر اور اشرافیہ سے سیاسی اقتدار چھین لیا جائے۔

اس کی کتاب ''صنعت کاروں کے سوال جواب کی کتاب'' 1823 میں منظر عام پر آئی۔ وہ کمال دور اندیش آدمی تھا۔ اسے نظر آ رہا تھا کہ دنیا صنعتی ہو جائے گی اور سائنس و ٹکنالوجی سارے مسائل حل کر دیں گے۔ اس کی کتاب ''ادبی فلسفیانہ اور صنعتی رسالے'' 1825 میں شائع ہوئی۔

سینٹ سائمن مستقبل کے صنعتی سماج میں مسیحیت کے صرف انسان دوست عناصر باقی رکھنا چاہتا تھا۔ اس نے یہ سائنسی راز دریافت کر لیا کہ ہر نیا عہد پچھلے عہد سے ترقی پسند ہوتا ہے۔ اور ایک مقررہ مدت کے بعد ایک اور عہد کے لئے جگہ خالی کر دیتا ہے جو اس عہد سے زیادہ ترقی پسند ہوگا۔ وہ یہ ساری دریافتیں اپنی آخری کتاب ''جدید مسیحیت'' میں کرتا ہے۔ وہ ایک ایسے سماج کا حامی ہے جو لوگوں کی بڑی اکثریت کو خیر پہنچائے۔ وہ سماج ہی کو علم کا سرچشمہ قرار دیتا ہے۔ البتہ وہ اپنے نئے ''صنعتی سماج'' میں نجی ملکیت کو ختم نہیں کرتا۔ وہ سرمایہ داروں سے نصیحتیں کرتا رہتا ہے کہ غریبوں سے ہمدردی کریں۔ وہ تبلیغ تو کرتا تھا طبقاتی جدوجہد نہیں کرتا تھا۔

اُس نے آخر میں لکھا ''شہزا'' ادو! خدا کی آواز سنو، میرے منہ سے: دوبارہ چھے مسیحی بنو، اس اعتصاد کو پھینک دو کہ کرائے کی فوجیں، اشرافیہ، heretical ملاّ، کرپٹ جج تمہارے اصل مددگار ہوں گے۔ مسیحیت کے کام پر ایک ہو جاؤ اور اُن فرائض کی ادائیگی سیکھ جو مسیحیت طاقتوروں پر

لا گو اپنی توانائیاں بہت غریب اکثریت کی بہتری کے لیے جتنی تیزی سے ممکن ہو لگا ئیں‘‘

سینٹ سائمن اور اُس کے پیروکاروں نے ’’آلاتِ محنت، زمین اور کپٹل کو سماجی فنڈ‘‘ میں دینے کا کہا۔ وراثت میں ملی دولت کو ضبط کرنا تھا۔ سینٹ سائمن مشقت کرنے والوں کی ایک وسیع ایسوسی ایشن قائم کرنا چاہتا تھا۔ انہیں اُن کی صلاحیت کے مطابق کام سونپے جانے تھے اور انہیں اُن کے کام کے مطابق معاوضہ ملنا تھا۔

سینٹ سائمن کے ڈوکٹرائن میں جنگ کا خاتمہ شامل تھا اور بنی نوعِ انسان کے لیے ’’کافی‘‘ کے ایک غیر مختتم زمانے کی ابتدا شامل تھی۔

اور یہ سب کچھ فرض شناس پروپیگنڈہ کے ذریعے رونما ہونا تھا(1)۔

اُس کے نام پہ ایک سوشلسٹ نظام کا نام پڑ گیا: سینٹ سائمنزم۔ اس نظام کی خاص باتیں یہ تھیں: ساری جائیداد ریاست کی ہو۔ جس کی انتظام کاری صنعتی مالکوں اور سائنس دانوں کے ہاتھ ہو۔

مارکس اور اینگلز نے ’’جرمن آئیڈیالوجی‘‘ میں ایک بڑا حصہ سینٹ سائمن اور اس کے پیروکاروں کے لئے وقف کر دیا۔ لینن نے بھی اس عظیم یوٹوپیائی سوشلسٹ کی خدمات کو سراہا۔

کہتے ہیں کہ جب وہ مر رہا تھا تو اس نے اپنے ایک شاگرد سے کہا ’’میری ساری زندگی کو ایک تصور میں بیان کیا جا سکتا ہے: سارے انسانوں کو اپنی faculties کی آزادانہ ترقی دینے کی آزادی ہو۔ مستقبل ہمارا ہے!۔۔۔۔ اس نے اپنا ہاتھ اپنے سر پہ رکھا اور مر گیا۔

ریفرنس

1۔ رابرٹ سروس۔ کامریڈز۔ 2007۔ میکملن۔ صفحہ 17۔

چارلس فیوریئر

(1772............10اکتوبر1837)

سینٹ سائمن سے دس سال چھوٹے فیوریئر کا باپ ایک دکاندار تھا۔ وہ مذہبی شخص اور چرچ کا پکا حمایتی تھا۔ مگر دکانداری میں تھوڑی سی ہیرا پھیری کو بھی برا نہیں سمجھتا تھا۔ تقریباً بالکل ہی اَن پڑھ بیٹا یہ سب دیکھتا رہا اور اس کی نشو ونما اور طرح سے ہوتی رہی ۔ کچھ ہی عرصے میں ماں باپ کو اندازہ ہوگیا کہ بیٹا کم از کم اپنی رضا اور خوشی سے دکاندار نہیں بنے گا۔۔۔۔اس لیے کہ وہ واقعیٔ زندگی بھر دکانداری سے، تجارت سے نفرت کرنے لگا۔

ظلم کے خلاف فیوریئر کا abhorrence ترس کے لیے اس کی تقریباً دیوانہ وار capacity جس نے سکول کے زمانے میں اُسے اپنے چھوٹے سے ساتھیون کے دفاع میں خوفناک لڑائیوں پر مجبور کیا تھا۔ اور جس نے ساٹھ سال کی عمر میں ایک غریب ملازمہ لڑکی کے لیے کچھ کرنے کی کوشش میں گھنٹوں تک بارش میں چلنے پر مجبور کیا جسے اس نے دیکھا تک نہ تھا مگر سنا تھا کہ اس کی مالکن اس پر ظلم کرتی ہے۔

فیوریئر دس سال کی عمر میں کالج میں داخل ہوا۔ جغرافیہ اُس کا پسندیدہ مضمون رہا۔ ایسا شوق کہ پہلے اٹلس خریدنے میں وہ اپنے پیسے خرچ کرتا رہا اور ذرا بڑا ہوا تو پھر سفر کرنے میں۔

وہ لیونز شہر میں کتابیں پڑھتا رہا۔ روٹی روزی کماتا رہا۔ یہیں پر اس کے کمیونسٹ خیالات تشکیل پائے۔

1789 کا انقلابِ فرانس اس شہر کی ترقی یافتہ بورژوازی پر ایک مصیبت بن کر آیا۔ اس انقلاب نے شہر کے صاحبِ جائیداد طبقے کو مالی اور روحانی طور پر سخت زخمی کردیا۔ چنانچہ 29 مئی 1793 میں لیونز شہر میں بغاوت ہوئی ۔ جیکو بن کا تختہ الٹا ، لیونز کمیون کا میئر قتل ہوا۔ فیوریئر نہ صرف یہ کہ یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا' بلکہ وہ اس میں شامل رہا۔

مگر یہ ردِعمل دیر تک قائم نہ رہ سکا۔ شہر پر دوبارہ قبضہ ہوا۔ فیوریئر بھی گرفتار ہوا۔ مگر وہ سزا سے بچ نکلنے میں کامیاب ہوا۔ وہ relent less persistency کے اہل تھا۔ اس نے systematic exactitude کے لیے ایک passion کے ساتھ گہرے انسانی ہمدردیوں کو ایک خاص طریقے سے ملایا۔ اسے اُس صنعتی اور کمرشل نظام کے بدترین پہلوؤں کا خود تجربہ حاصل تھا جو کہ بہت تیز رفتاری کے ساتھ مغربی سوسائٹی پہ نمایاں ہونے چلا آرہا تھا۔ بعدازاں وہ فوج میں بھرتی ہوا۔ اور کچھ عرصہ اس شعبے میں نام کمانے کے بعد 1794 میں صحت کی خرابی کی بنا پر سبکدوش ہوا۔ اور ایک بار پھر نفرت انگیز تجارت سے وابستہ ہوگیا۔

مگر تجارت سے وابستگی کے ساتھ ہی بورژوازی سے نفرت کئی گنا بڑھ گئی۔ ایک عجیب واقعہ ہوا۔ مارسیلیز میں اس کے مالک نے سیلز مین فیوریئر کو ایک ہزار ٹن چاول سمندر میں گرانے کا حکم

دے دیا۔صرف اس لیے کہ اس طرح قیمتیں بڑھ جائیں۔قیمتوں میں اضافے کی خاطر ذخیرہ اندوزی اور سمندر بُردی کے اس کھیل میں غریب طبقے کا تو ستیاناس ہونا تھا۔فوریئرؔ اِس درندہ نظام کے خلاف ہوتا گیا۔اور پھر جب پیرس کے ایک ہوٹل میں ایک سیب عام منڈی کی بہ نسبت سو گنا زیادہ قیمت پر اُسے دیا گیا تو اس کے نظریات مزید پختہ ہوگئے۔

1803 میں اس نے ''عالمگیر ہم آہنگی'' نامی مضمون لکھا جس میں اُس نے بورژوا نظام سے نفرت اور ایک سماجی اصلاحی نظام کی بات کی۔1808 میں اس نے مفصل، مدلل اور قابلِ برداشت اسلوب کے تحت ایک پوری کتاب لکھ ڈالی : '' چار تحریکوں کا نظریہ اور عمومی تقدیریں''۔1822 میں ''اس نے داخلی اور زرعی ایسوسی ایشن'' چھاپا جس میں اجتماعی محنت کے بنیادی سیل (انجمنیں) بیان کردیے جنہیں وہ ''فلینکس'' کہتا تھا۔1828 میں اس کی ''جدید صنعتی اور سماجی دنیا'' نامی کتاب چھپی۔یہ ابھی تک کی اُس کی ساری تحریروں سے زیادہ اچھی کتاب ثابت ہوئی۔

1832 تک اس کے پیروکار اس قابل ہوگئے کہ انہوں نے ایک تجرباتی فیلنکس قائم کی اور اس کے لئے شیئر ہولڈرز جمع کرنے شروع کیے مگر انجام وہی ناکامی کی صورت میں ہوا۔

فوریئرؔ نے ثابت کیا کہ بورژوا نظام اپنے ساتھ بدنظمی، انارکی اور بدترین استحصال لاتا ہے۔اس نے یہ بھی بتایا کہ بورژوا سماج میں عورت کی تذلیل ہوتی ہے۔

یہ خوبصورت تصور سب سے پہلے فوریئرؔ ہی نے پیش کیا کہ معاشرے کی آزادی کو ناپنے کے لئے اُس معاشرے میں عورت کو میسر آزادی کو ناپنا چاہیے۔

فوریئرؔ یورپی فلسفہ کی روایت کو denounce کرنے سے کبھی باز نہ آیا، جس کی راہنمائی میں انسانیت خود کو 23 سائنسی صدیوں تک خون میں نہلاتی رہی ۔ اس کا اعتقاد تھا کہ پیشہ ور فلاسفروں کو discredit کرنے کے لیے ، سیاست اور اخلاقیات کی اُن لائبریریوں کو ''Confute کرنے کے لیے ہی خدا نے اُسے منتخب کرلیا تاکہ وہ خدا کے رازوں کو بنی نوع انسان کو expositor کرنے۔

فوریئرؔ کا ایک بہت بڑا کام یہ ہے کہ اس نے تاریخ کو چار حصوں میں تقسیم کردیا:

وحشت، بربریت، پدرسری، اور بورژوا نظام۔

اس نے یہ بھی دریافت کیا کہ سرمایہ داری نظام بے روزگاری کو جنم دیتا ہے۔یہ بھی کہ ریاست، ریاستی اقتدار، سائنس، اخلاقیات، فلسفہ اور مذہب امیروں کے مفادات کی حفاظت کرتے ہیں۔چنانچہ سرمایہ داری نظام کو اس کی سماجی تنظیم کے ساتھ مکمل طور پر ختم کرنا چاہیے۔مگر وہ آگے نہ سوچ سکا۔اسے سمجھ میں نہیں آیا کہ بدترین ظالمانہ کپٹلزم ختم کرکے کون سا نظام اپنایا جائے۔نہ ہی اس بات پر کہ کپٹلزم ختم کون کرے گا۔وہ اس کے لئے طبقاتی جدوجہد تک نہ پہنچ سکا۔وہ تو دلیل کے ذریعے سماج کی پرامن تبدیلی پر عقیدہ رکھتا تھا۔وہ حکمرانوں کے ہاں بھی انسان دوست لوگ ڈھونڈنے گیا جو ایک ایسوسی ایشن بنا سکتے ہیں۔

اس کا خیال تھا کہ انسان فطری طور پر اچھا ہے اور یہ صرف ادارے میں جنہوں نے اسے perveat کردیا۔اس کا کہنا تھا کہ انسانی فطرت کو اُسی unpack کیا جاسکتا ہے جس طرح کہ ایک tool.chest کے اندر کی چیزوں کو انسانی passions (جبلتوں اور مفادات) اُس کی محدود تعداد کے سامنے unpack کیا جائے جو کہ خدا نے ہمیں مختلف مقاصد کے لیے عطا کر رکھے ہیں۔سب ضروری تھے اور ماڈرن سوسائٹی کے ساتھ مشکل صرف یہ بات ہے کہ اِن ''passions'' کو غلط استعمال کیا گیا۔اگر صرف proper passions کو proper استعمال کی طرف لگایا جائے، تو ''Harrmony'' کی سلطنت prevail ہوسکتی ہے۔

یہ بتانے کے لیے کہ فرد کا مفاد اجتماع کے مفاد کے ساتھ compatible ہے اس نے وسیع تر سماج کے اندر محدود خود انحصار سوسائٹیاں منظّم کی جانی چاہییں۔

اس کی تجویز تھی کہ امیروں اور غریبوں کے بچوں کو ایک جیسی تعلیم دینی چاہیے۔وہ کم سے کم subsistence کی ضمانت کے بعد آمدن کو یوں تقسیم کرنا چاہتا تھا، 4/12 واں حصہ سرمایہ کو، 5/12 مزدور کو، اور 3/12 ٹیلنٹ کو۔غیر خوشگوار کام کا معاوضہ زیادہ ہونا تھا۔

اس نے عام اعلان کر رکھا تھا کہ وہ ہر روز دوپہر کو گھر رہے گا تاکہ کوئی امیر شخص اس کے

پراجیکٹس کے بارے میں بات کرنے اور انہیں فائنانس کرنے میں دلچسپی رکھے۔مگر گوکہ وہ دس سال تک ہر روز وہاں موجود رہتا، ایک بھی شخص نمودار نہ ہوا۔

فیوریئر زندگی کے آخر تک موزوں سماجی حالات ڈھونڈ تارہا۔اوراس نے آخر تک طبقاتی مصالحت کی گنجائش چھوڑے رکھی۔

فیوریئر بڑا آدمی تھا جو حتمی نتیجے تک تو نہیں پہنچا مگر ہمیں ایسے زریں اصول دے گیا جو بعد میں عوامی سائنسی انقلابات کا اٹوٹ حصہ رہے۔

اس غیر شادی شدہ فلاسفر نے صحت کی خرابی کے باوجود کام جاری رکھا۔اور 10 اکتوبر 1837 کو اپنے یقین پہ پکا مگر بہت disappointed وہ اپنے معمولی سے کمرے میں مردہ پایا گیا۔

جین جاریز

(3 ستمبر 1859............1914)

فرانس کا یہ انقلابی 3 ستمبر 1859 کو ایک دیہی علاقے میں پیدا ہوا۔سکول میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد 1869 میں کالج میں داخل کرادیا گیا۔اس زبردست پڑھاکو اور ذہین طالب علم کو 1876 میں انعام کے بطور سینٹ بارب کالج میں داخل کردیا گیا۔اس کی ذہانت اُسے اچھے سے اچھے تعلیمی اداروں میں پہنچاتی رہی۔اس طرح 1881 میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد اُس نے یونیورسٹی میں فلسفہ پڑھانا شروع کردیا۔

وہ ایک ترقی پسند شخص بنا۔1885 کو وہ پارلیمنٹ کا ممبر منتخب ہوا۔کم عمر جاریز نے پارلیمنٹ کا ایک بھی اجلاس قضا نہ کیا۔وہ ترقی پسند اصلاحات کے حق میں تقریریں کرتا تھا۔اس نے مزدورعوام کی زندگی سہل بنانے کے ہر اقدام کی حمایت کی۔جاریز مقبول ہوتا گیا۔وہ رفتہ رفتہ سوشلسٹ خیالات اپناتا رہا۔اس نے جرمن سوشلزم کی تاریخ پڑھی،لوئی بلانک، پرودھون، گسڈے ،لافارگ،اورلاسال کی تصانیف کا مطالعہ کیا۔کارل مارکس کی تصانیف نے اس پر بہت اثر ڈالا۔

جولائی1890 میں وہ اپنے شہر کا ڈپٹی میئر منتخب ہوا۔1893 میں سوشلسٹوں کے امیدوار کے بطور وہ چیمبر آف ڈپٹیز میں منتخب ہوا۔فلسفے کا یہ پروفیسر مستقل مزاجی کے ساتھ مزدوروں کا نمائندہ ہی رہا۔وہ ایک زبردست متحرک پارلیمنٹرین رہا۔وہ دلچسپ شخص تھا، مارکسزم کو دوسری تعلیمات کے ساتھ جوڑنے کی کوشش کرتا رہا۔وہ طبقاتی جدوجہد کے بغیر سوشلزم آسکنے کا نظریہ رکھتا تھا۔

1 8 9 0 کی دہائی میں جاریز کئی جلدوں پر مشتمل اپنی کتاب Histoirice-Socialiste-Collective پر محنت سے کام کرتا رہا۔اس نے پہلی چار جلدیں فرانس کے عظیم انقلاب کے لئے وقف کردیں۔تاریخ پر لکھی گئی اپنی کتاب میں جاریز نے مارکس واینگلز کی کتاب ’’کمیونسٹ مینی فیسٹو‘‘ کا بھی تجزیہ پیش کیا۔وہ مارکس کے قریب ہوا۔اس نے فرانس کی سوشلسٹ پارٹی کی بنیاد رکھنے میں اہم کردارادا کیا۔

جاریز1902 میں پارلیمنٹ کا ممبر منتخب ہوا۔1904 میں اس نے "Humanite" نامی ایک اخبار نکالا۔یہی اخبار بعد میں 1920 میں فرانس کی کمیونسٹ پارٹی کے قیام پہ پارٹی کا ترجمان بنا جس میں ویت نام کا ہوچی منہ لکھنے لگا تھا۔

وہ 1905 کے روسی انقلاب کا حامی بنا۔یہ بہت بصیرت کی بات تھی۔اس کا سوشلزم صراطِ مستقیم والا تو کبھی نہ بنا مگر وہ سرمایہ داری نظام کے خلاف بے انتہا قوت، اخلاص اور بہادری سے لڑا اور اپنے عہد کے دوسرے یوٹوپیائی سوشلسٹوں کے مقابلے میں سائنسی مارکسزم سے بہت قریب تھا۔

جین جاریز بورژوا جنگ پسندوں کا سخت مخالف تھا۔اس سلسلے میں وہ دنیا کے اُن چند راہنماؤں میں سے تھا جو دوسرے ممالک سے جنگ کرنے کے بجائے ممالک کے مزدوروں سے اپیل کرتے تھے کہ وہ اپنی جنگباز حکومتوں کا تختہ الٹ کر جنگ روکیں۔اسے وزارتوں پیسوں کی

پیشکش ہوئی مگر جاریز اپنی حق بات پر ڈٹا رہا۔

31 جولائی 1914 میں اُسے قتل کردیا گیا۔کس نے ؟۔ارے بھئی فرانسیسی بورژوازی کےسب سے رجعتی اورشاونسٹ حلقوں نے۔

قرۃ العین طاہرہ

دنیا کوایک نئے تحرک سے آشنا کیا
اشعار جوایک نئی کائنات کی گونج ثابت ہوئے
یوں اسے ایک ابدی معصومیت حاصل ہوئی
وسیع القلبی ،روشن فکری کا،
ایک عالمی ورثہ ہے
جواس نے سب سے بانٹا ہے

روسی شاعرہ انا اخماتووانے اپنی ہم عصر ایرانی شاعرہ کوان الفاظ کے ساتھ خراج عقیدت پیش کیا:

قرۃ العین طاہرہ کا اصل نام فاطمہ زریں تاج تھا۔ وہ ایک مشہور عالم ابن حاجی ملا صالح کی بیٹی تھی۔اس کا پورا خاندان علم وفضل میں شہرت رکھتا تھا۔ یہ ایران کا چوٹی کا خاندان سمجھا جاتا تھا۔ قرۃ العین کو تفسیر، حدیث، فقہ اورالٰہیات میں پوری مہارت حاصل تھی۔فاطمہ زریں تاج کو قرۃ العین کا لقب عطا ہوا اور اس لقب کو اتنی شہرت حاصل ہوئی کہ اس کا اصل نام دب کر رہ گیا۔ فارسی ادب میں اُسے قرۃ العین طاہرہ لکھا جاتا ہے اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ قرۃ العین اس کا نام اور طاہرہ تخلص تھا مگر یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔قرۃ العین کا لقب اُسے سید کاظم نے اور طاہرہ کا لقب اس کے والد نے اُس پاکیزگی سے گوندھے فکروعمل کے باعث دیا تھا۔اس طرح سے دونوں لقب تھے جنہوں نے اس کے نام کو تقریباً ناپید کردیا۔

قرۃ العین حسنِ نسوانی کا دل آویز مرقع تھی۔خوبصورتی پر خوب سیرتی سونے پہ سہاگہ۔ اوران سب پہ بھاری بات یہ تھی کہ حسین وجمیل روح وبدن والی ہستی عشق کرتی تھی۔اور اپنے عشق کوروح کی بلند پروازی کے ایندھن کے بطور استعمال کرتی تھی۔اگلی صفت یہ کہ قراۃ العین شاعری کرتی تھی۔اس کے لفظوں میں سچائی بھری خوشبو اور ندرت سے لبریز تمکنت تھی۔ان سب اوصاف کو اُس نے ایک نعرے کے اندر سمو دیا: مساواتِ مرد وزن۔ اسی ایک لولاکی سچ کے لیے اُس نے ہزاروں مددگار سچ تلاش کیے اور استعمال کیے۔اور سچ اور محبت کو سچ بنا ڈالنے والی شخصیت مقامی، زمانی نہیں رہ جاتی وہ آفاقی بن جاتی ہے۔عام مشاہدہ کے جب سچ اور عشق ایک بن جائیں تو جان تو جاتی ہے۔سو جان اس کی بھی گئی (1845 میں) جب وہ 35 برس کی تھی۔وہ دو بیٹوں اور ایک بیٹی کی ماں تھی۔گلا گھونٹ دیا گیا تھا اُس کا۔(کبھی کوئی گلا گھونٹے جانے والے قافلے کی مردم شماری کرسکا ہے؟)۔مگر اَن گنت گلا گھونٹیوں کے باوجود کیا کبھی کوئی سچ کا گلہ گھونٹ سکا ہے، فکر کا، عشق کا، ارادے کا، جدوجہد کا، اور شہادت کا؟......جسموں کے جلاد جسموں ہی کے جلاد رہتے ہیں، اُس سے ایک انچ بھی بلند نہیں ہوتے۔

اس کی نثر بھی مصنوعیت سے پاک رہتی تھی اور وہ بہت ہی صناع ادیبہ تھی۔

اس کے ساتھ ہی وہ سحر البیان خطیبہ تھی۔وہ بولتی تھی تو اس کے پُرجلال لہجے میں حسن بیان

کے گلستان مہک اٹھتے تھے۔

ایک اور بات جس نے اُسے تاریخ میں منفرد کردیا وہ یہ تھی کہ اس نے ایک سوچ، شعور اور حصولِ مقصد کے لیے سرفروشانہ جدوجہد کی اور جان نثارانہ طرزِ عمل کیا۔

قرۃ العین ایشیاء کی پہلی خاتون تھی جس نے حقوقِ نسواں کا علم بلند کیا اور خواتین میں اُن کے مقام کا شعور جگانے کے لئے بیداری کی تحریک اٹھائی۔ اس کا چچا ایران کا ''مجتہد'' تھا۔ قرۃ العین کی شادی اپنے چچا کے بیٹے محمد تقی سے ہوئی۔ سب سے پہلے اس نے کوشش کی کہ اپنے گھر والوں کو اپنے خیالات سے اتفاق کرنے پر آمادہ کرے۔ اس کے والدین تو کسی حد تک اُس کے ہمنوا ہوگئے مگر شاید اس کا شوہر اور سسرال اس سے متفق نہ ہوسکے۔ وہ اپنے مقصد کے ساتھ اتنی مخلص تھی کہ اس نے سمجھ لیا کہ متضاد خیالات کے باعث وہ شادی کا بندھن نبھا نہیں سکے گی۔ چنانچہ اُسے طلاق ہوگئی۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ اس طلاق کے بعد وہ محمد علی بروش کے پاس رہنے لگی۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ وہ اپنے والدین کے گھر رہنے لگی۔ بہر حال صورت جو بھی ہو اس کی عصمت وعفت پر کوئی انگلی نہیں اٹھا سکتا۔ کیونکہ بابی مذہب میں کردار اور سیرت کی پاکیزگی پر بڑا زور دیا گیا ہے۔ اُسے تو اس مذہب کی مبلغہ اول کا درجہ حاصل تھا۔

قرۃ العین کی شاعری بھی اپنی طرز کی انوکھی شاعری ہے۔ اس سے پہلے فارسی شاعری غزل وشراب میں غرق تھی یا تصوف اور بے جان الوہیت میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اُس نے پہلی دفعہ شاعری کا رخ انسان اور اس کے حقیقی مسائل کی طرف موڑا۔ مگر کہیں بھی اس نے اپنی شاعری کو خشک پروپیگنڈا نہ بننے دیا۔ اس نے اپنی شاعری میں صداقت کے حسن کے ساتھ شعریت کی دلربائی اور دل کشی قائم رکھی۔

ایشیاء میں عورت کی ہمیشہ تحقیر وتذلیل کی گئی۔ اس کی تحقیر میں جو تذلیل آمیز ضابطہ اخلاق مرتب کیا گیا وہ ادب میں بھی راہ پا گیا۔ اس کی مثال دیکھئے مگر اس سے پہلے ایک لفظ سمجھ لیجئے فارسی زبان میں ''زدن'' مصدر کے معنی ہیں ''مارنا'' اس مصدر سے ''زند'' فعل مضارع ہے اور ''زن'' فعل امر ہے اس کے معنی ہیں ''مار''۔ ادھر ''زن'' کے معنی عورت بھی ہیں اب دیکھئے فارسی شاعر کس طرح لفظوں کے کھیل میں عورت کی تذلیل کرتا ہے۔

1

اگر نیک بودے سرا حواں زن
زناں را ''مزن'' نام بودے نہ ''زن''

ترجمہ:

اگر عورت کی سرشت نیک ہوتی
تو عورت کا نام ''مزن'' (مت مار) ہوتا نہ کہ زن (مار) ہوتا۔

2

چہ خوش گفت جمشید با رائے زن
کہ یا پردہ یا گور بہ جائے زن

ترجمہ:

جمشید نے اپنے ایک صاحب الرائے یعنی عقلمند مصاحب سے کیا اچھی بات کہی کہ عورت کے لئے بہترین جگہ یا پردہ ہے یا قبر

3

مشو ایمن از زن کہ زن پارساست
کہ خر بستہ بہ گرچہ دزد آشناست

ترجمہ: اگر عورت پارسا بھی ہو تو اس کی طرف سے مطمئن نہ ہو
کہ گدھے کو باندھ کر رکھنا بہتر ہے چاہے چور دوست بھی ہو۔

قرۃ العین طاہرہ کے لئے خواتین کی یہ تذلیل نا قابلِ برداشت تھی اُس نے خواتین کی عظمت کا پرچم بلند کیا اور کہا۔

مادر خودار چناں دشنام دادن سفلگی
آنکہ بردہ رنج پر دردن ترا در طفلگی

ترجمہ:

جس ماں نے بچپن میں تجھے پالنے کی مصیبت اٹھائے اُسے اس طرح گالی دینا کمینگی ہے۔ ایک جگہ خاتون کو دعوت عمل دیتے ہوئے کہتی ہے۔

پیکر ایثار تو ایں چادر تحقیر سوز
صبح کردن ایں شب تاریک رادشو ارنیست

ترجمہ:

اے پیکرِ ایثار تحقیر کی اس چادر کو جلا ڈال
اس اندھیری رات کو صبح میں بدلنا مشکل تو نہیں۔

جب قرۃ العین کو علم ہوا کہ ایران میں سید محمد علی محمد باب ''مہدویت'' کے دعویٰ کے ساتھ میدان عمل میں آ گیا ہے تو وہ اس کے پاس گئی اور حقوقِ نسواں کے متعلق اس سے گفتگو کی۔ اُسے معلوم ہو گیا کہ باب کی دعوت اس کے خیالات سے بھی ہم آہنگ ہے اور اس میں اُس کے لئے مزید روشنی بھی ہے تو باب پر ایمان لانے والے ''اولین لوگوں'' میں شامل ہو گئی۔ باب کی دعوت کا اصول عمل امن عالم کے لئے کوشاں ہونا تھا۔ قرۃ العین اس کی پرچارک تھی امن عالم کے سلسلہ میں اس کا ایک قیمتی شعر دیکھئے۔

نیست مشکل ایں زمیں را ساختن باغ بہشت
ز آہن شمشیر باید ساختن آلات کشت

ترجمہ:

اس زمین کو باغ بہشت بنانا کچھ مشکل نہیں
تلواریں توڑ کر اُن سے حاصل شدہ لوہے سے ہل، کدال اور کھی بنا لینے چاہئیں

باب کے پیروکاروں پر ظلم وتشدد کے دروازے کھل گئے۔ گرفتاریاں ہوئیں اور سر کٹنے لگے تو قرۃ العین بھی گرفتار ہوئی۔ جب اسے زندان میں ڈالا گیا تو اُس نے کہا ''تم کسی بھی لمحے میری جان لے سکتے ہو مگر خواتین کی آزادی کی جدوجہد کو نہیں روک سکتے''۔

اس دوران شاہ ایران پر قاتلانہ حملہ ہوا جس کا ذمہ دار طاہرہ کو ٹھہرا کر اس کی قسمت کا فیصلہ کرنے اُسے شاہ وقت ناصر الدین قاچار کے دربار میں لایا گیا۔ بادشاہ نے دیکھتے ہی اس کے حسن و جمال سے متاثر ہو کر کہا ''یہ تو خداوند کریم کا عظیم شاہکار ہے اسے چھوڑ دیا جائے''۔ پھر قرۃ العین سے مخاطب ہو کر کہا ''خاتون محترم تمہارا مقام بہت اونچا ہے۔ تم ملکہ کے مرتبہ پر فائز کی جا سکتی ہو تمہیں یہ زیب نہیں دیتا کہ بازاروں اور گلیوں میں علی باب کی مناجاتیں پڑھتی پھرو۔ آؤ کہ قصر شاہی تمہارا منتظر ہے''

قرۃ العین نے برجستہ کہا۔

تو وملک جاہ سکندری، من ورسم و راہ قلندری
اگر آں نکوست تو درخوری، وگرایں بداست مرا سزا

ترجمہ:

تو ہے اور بادشاہت اور سکندرانہ شان وشوکت، میں ہوں اور قلندرانہ انداز زیست۔
اگر وہ اچھا ہے تو مجھے مبارک اور اگر یہ برا ہے تو یہی میری سزا ہے یعنی یہ برا سہی میں اسی پر خوش ہوں۔

شاہی فرمان کے مطابق باب کے ہزاروں پیروکار تہ تیغ کر دیئے گئے۔ باب کے ایک فداکار پر جلاد نے تلوار اٹھائی تو اُس نے کہا ''اگر میں تلوار کے پہلے وار میں زندہ رہا تو تجھے ایک مفید بات بتاؤں گا'' جلاد کے پہلے وار سے اس کی گردن آدھی کٹ گئی تو اس نے اپنی گردن کے لہو سے ہاتھ رنگتے ہوئے کہا ''جو بات تجھے بتانا تھی وہ یہ ہے کہ ''مجھے اپنے ہی خون کی قسم علی محمد باب سچا نبی ہے۔ میرے جیسے لاکھوں لوگوں کے خون پر قربان ہوں''۔

ایسے ہی فداکاروں کی ترجمانی کرتے ہوئے قرۃ العین طاہر نے کہا تھا۔

گر بچشم ماہی دیدی جمال مرگ ما
درصف ما تو ہمی شامل شدی جلاد شر

ترجمہ:

اے شر پسند قاتل اگر تو ہماری آنکھوں سے ہماری موت کا جمال دیکھتا تو تو بھی ہم مقتول ہونے والوں کی صف میں آ کھڑا ہوتا۔

کہا جاتا ہے کہ قرۃ العین کو مخالفوں کے ہجوم نے گلا گھونٹ کر مار دیا تھا۔

قراۃ العین طاہرہ عورتوں کے لیے تعلیم کا حق چاہتی تھی، وہ انسان کے لیے حریتِ فکر کا حق چاہتی تھی.........اس پہ تشدد کیا گیا۔ اس کی موت تشدد کی موت تھی۔ حق اور سچ کی راہ کی بہت بڑی وکیل تشدد کر کے ماردی گئی۔ آؤ اقبال کی ساری خطائیں معاف کرنے کی کوشش کریں جس نے ہماری اس راہبر کو غیر معمولی خراج عقیدت پیش کیا تھا:

از گناہ بندہ صاحب جنون
کائنا ت تازہ آید بروں
شوق بے حد پردہ ہارا بردرد
کہنگی را ازتماشامی برد
آخراز دار ورسن گیرد نصیب
بر نگر زندہ از کوئے حبیب

علامہ اقبال لکھتا ہے:

اہل ایمان کی پہچان یہ ہے کہ
موت کا سامنا تبسم سے کرتے ہیں

اس اعتبار سے طاہرہ آخری دم تک اپنے عقیدے پر سختی سے قائم رہی۔ جاوید نامہ کی دو نظموں میں طاہرہ کو بھرپور خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے جبکہ ایک میں طاہرہ کی معروف نظم کا حوالہ بھی دیا ہے۔ ''نوائے طاہرہ'' کے عنوان سے لکھی گئی اس نظم کا اختتام علامہ اقبال نے ان اشعار کے ساتھ کیا ہے:

دیرینہ غموں سے آشنا عشاق کا جذبہ
روح میں نیا ارتعاش پیدا کرتا ہے
یہ مجھے پرانے دکھوں سے تو نجات دلاتا ہے
پر شب بھر ایک طلاطم برپا رہتا ہے
میری سمندر سی عمیق فکر
ایک نئی ذات سے ٹکراتی ہے
اور ساحل پر ایک سونامی بن کر پھیل جاتی ہے
رومی نے کہا: زماں کو اپنی گرفت میں رکھو
اگر تم چاہتے ہو کہ گتھیوں کو سلجھا پاؤ
اپنے ہی نئے تخیلات کے اسیر بنو
اگر تم اپنے شعور کو
دوزخ کے عذاب سے بچانا چاہتے ہو

دوسری نظم میں علامہ اقبال طاہرہ کو تمام انسانی خوبیوں کا مجسم قرار دیتے ہوئے کہتا ہے:

ایک عاصی جو اپنے جذبے میں مدہوش ہو
ایک نئی کائنات جنم لیتی ہے

ایک لامحدود وابستگی تمام پردوں کو چاک کر ڈالتی ہے
اور عقیدہ پرستی کی شکست ہوتی ہے
دار کی رسی ان کا مقدر ٹھہرتی ہے
کہ عشاق اپنے محبوب کے ہاں زندہ نہیں لوٹتے

پوری شان کے ساتھ وہ آج بھی ہر طرف موجود ہے
ایک لمحے بھر کے لیے بھی مت سوچو

مزدك Vol-1

کہ وہ اب دنیا میں موجود نہیں
اس نے روح عصر کا پیرہن اوڑھ لیا ہے
اور اس میں ایک لامحدود گنج پوشیدہ ہے

والٹیئر

21 نومبر 1694ء۔ مئی 1778

انسان عظیم بنتا ہی اس وقت ہے جب وہ اُن اعضا کو استعمال کرے جو اُسے جانوروں سے ممتاز بناتی ہیں۔ اُن میں سے ایک عضو دماغ ہے۔ جس کا کام سوچنا اور تفکر کرنا ہے۔ وہی انسان عظیم ہوتا ہے جو سوچتا ہے، فکر کرتا ہے، مفروضے بناتا ہے، اُن کی ضد کھڑی کرتا ہے، اُن دونوں کو باہم جدل میں ڈالتا ہے اور یوں تیسری چیز اخذ کرتا ہے۔ اور جو انسان دوسرے انسان کو ایسا کرنے کی ترغیب دے تو وہ اور بھی بڑا انسان ہوتا ہے۔

والٹیرایسے انسانوں میں سے ایک تھا۔اس نے صرف ایک انسان کوسوچنے سمجھنے اورخود اپنی راہ متعین کرنے پرنہیں اکسایا بلکہ وہ تو تین صدیوں سے ایسا کرتا آرہا ہے۔ بالخصوص یورپ میں توانسان کی صرف اِسی محنت سے نظام بدل گئے ،حکومتیں بدلیں، تحریکیں بنیں، جدوجہدیں ہوئیں، جنگیں جمیں،تقلید کوشکست ہوئی اور تفکر کی آزادی کا پرچم بلند ہوا۔

لاغروکمزوروالٹیئر (فرینکوئی میری اروئے) کے ہفت سالی دانت ٹوٹنے لگے تو ماں مرگئی ۔پستہ قد والٹیئر کتاب ومحفل کا دلدادہ تھا۔وہ ادیب بننا چاہتا تھا جبکہ اس کا باپ سماج میں بلند مقام اور دولت کی تلاش میں تھا۔اس نے اُسے وکیل بنانا چاہا۔ناکام ۔سفیر بنانا چاہا، وہاں ناکام ۔باپ نے ادب کے جنون میں مبتلا والٹیئر کو آخری سدھار کے لئے وراثت سے محروم کردیا۔

والٹیئر نے بادشاہ ، فیوڈلوں ، درباریوں کے خلاف تیزی تندی سے لکھنا شروع کردیا ۔والٹیئر ناانصافی پہ تو تڑپ جاتا۔نواب وانوبزادہ کے خلاف کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتا۔ نواب کے فکری باڈی گارڈ جب جواب نہ دے پاتے تو پھر طبعی باڈی گارڈ اس کی خاطر مدارت کرتے۔مگر لاغروکمزور والٹیئر دھن کا پکا تھا۔

پادری کا تو وہ ازلی ابدی مخالف تھا۔اُس کے چوغے کی ایک ایک تہہ میں اُسے بشر دشمنی نظر آتی تھی ۔موٹی گردن، نکلی توند اور گہرے ڈکار والا پادری مذہب فروشی کرکے اپنی دولت وآتش میں اضافہ کرتا جاتا۔اُس کے شاہ پرست وفیوڈل نواز فتووں نے خلقِ خدا کو نان شبینہ سے محروم کررکھا تھا۔والٹیر ہر عقیدہ کے ملا کے خلاف ہوگیا اور وہ اُن کی ''پاکی پاکیزگی'' کے اندر اُن کی قلبی غلاظت کو کھوج نکالتا اور عوام کے سامنے پیش کرتا۔

جواب میں حکومت نے کتابوں پر پابندی لگائی۔اُس کے ڈرامے سٹیج ہونے لگتے تو تیسرے دن تک پابندی ضرور لگتی۔اسی پابندی نے اُسے مقبولیت کے عروج پر پہنچایا۔اس کی کتابیں دھڑادھڑ بکنے لگیں۔اس کے ڈرامے ہاؤس فل۔ پیسہ ہی پیسہ۔

والٹیئر بہت استادی سے لڑتا تھا۔وہ کبھی بھی سیدھا حملہ نہیں کرتا تھا۔وہ تو اپنے وطن کی بات ہی نہیں کرتا تھا، دور دراز چین وایران کی بات کرتا۔مگر درباری وملا وبیوروکریسی تو جانتی تھی کہ وہ اُس کی آڑ میں کوڑے اُنہی کو مار رہا ہے۔اورعوام تو خصوصاً یہ بات سمجھتے تھے۔ایک لہرسی دوڑگئی بادشاہت و دربار کے ملّا کے خلاف۔والٹیر جیل۔گیارہ ماہ بعد کہیں اُس کے دوست اسے رہا کراسکے ۔

والٹیئر بہت جلد دوبارہ قید کردیا گیا۔کچھ عرصہ بعد اِس شرط اُسے رہا کیا گیا کہ وہ فرانس کو خیرباد کہہ دے گا۔چنانچہ رہا ہوکر آزادی کا یہ متوالا 1726ء میں لندن پہنچا۔

جن دنوں مشہور سائنسدان سرآئزک نیوٹن کا انتقال ہوا، والٹیئر انگلستان ہی میں تھا۔وہ دی ویسٹ منسٹر ایبے کے قبرستان میں نیوٹن کی تدفین کے منظر سے بڑا متاثر ہوا۔اس لئے کہ اُس وقت تک فرانس میں کسی سائنس دان کو نہ تو اس قدر عزت مل سکتی تھی، اور نہ اس کی اتنی شاندار تدفین ممکن تھی۔مزید برآں برطانوی پارلیمنٹ کے اختیارات اور عدلیہ کی کارکردگی دیکھ کر والٹیئر دنگ رہ گیا۔

1729ء میں کہیں جاکر والٹیئر کو فرانس واپس لوٹنے کی اجازت ملی۔اب اس کی عمر 35 سال ہوچکی تھی۔حکومت کو جلد ہی اپنے اس فیصلے پر پچھتانا پڑا۔والٹیئر کو ایک ریاضی دان سے معلوم ہوا کہ اس سال سرکاری حکام سے قومی لاٹری کے لئے ٹکٹ جاری کرتے ہوئے ایک فاش غلطی ہوئی ہے۔والٹیئر نے فوراً دوستوں کا ایک گروپ تشکیل دے کر تمام ٹکٹ خرید لیے۔اپنی غلطی کا احساس ہونے پر محکمہ خزانہ نے لاٹری کی رقم دینے سے انکار کردیا۔والٹیئر بدعنوان انتظامیہ کی کمزوریوں سے اچھی طرح آگاہ تھا۔وہ اس مسئلے کو عدالت میں لے گیا جہاں ایک دلچسپ سودے بازی کے بعد اسے اڑھائی لاکھ ڈالر کی ڈگری مل گئی۔والٹیئر نے یہ رقم امریکہ، ہندوستان اور دنیا کے دوسرے حصوں سے تجارت میں لگادی۔

والٹیئر اپنی دولت سے لطف اندوز ہوتا تھا۔اُسے نہ تو ولی ہونے کا دعویٰ تھا اور نہ راہب ہونے کا۔وہ آرام وآسائش، قیمتی کپڑوں اور خوبصورت گاڑیوں کا دل دادہ تھا۔اُسے دنیا کی تمام اچھی چیزیں پسند تھیں اور وہ دوسروں کو بھی یہی مشورہ دیتا تھا کہ اگرانہیں دنیا میں کسی کا حق چھینے بغیر اور کسی پر ظلم کئے بغیر دولت نصیب ہوتو وہ اُس سے پوری طرح لطف اندوز ہوں۔اسے ایسے

پادریوں اور امرا سے شدید اختلاف تھا جو خود تو عیش وعشرت کے متوالے تھے لیکن دوسروں کو دنیاوی خوشیوں سے دور رہنے کا درس دیتے تھے۔

والٹیئر انسانوں کے ساتھ ناانصافی پر تڑپ اٹھتا تھا۔ وہ دنیا بھر کے انسانوں کی محرومیوں کا مداوا چاہتا تھا۔ اسے عیاش پادریوں کی طرح انسانی مصائب کو ’’بھگوان کی مرضی‘‘ کہہ کر نظر انداز کرنا قبول نہیں تھا۔ اس قسم کے روشن خیال اور انسان دوست نظریات رکھنے کے جرم میں اسے فاسق وفاجر ٹھہرایا گیا۔ پھر ایک ذہین خاتون ایملی سے دوستی کی بنا پر اُسے بدکار کہا جانے لگا۔ ایملی ایک عیاش نواب کی مطلقہ بیوی تھی۔ نواب نے محض گھر والوں کے کہنے پر اُس سے شادی کی تھی اور پھر دوسری شادی کے پیچھے پڑ کر اُس کو بے آسرا چھوڑ دیا تھا۔ اس زمانے کے قوانین کے مطابق ایملی کو نہ تو طلاق مل سکتی تھی اور نہ وہ اپنا نکاح منسوخ کرا سکتی تھی۔ ایملی سے ملاقات کے بعد والٹیئر تادم مرگ اس کا وفادار رہا۔

والٹیئر کا کہنا تھا کہ انسان آزاد پیدا ہوتا ہے اور صرف اسے ہی اپنی ذات پر حکمرانی کا حق پہنچتا ہے۔ اُسے ظلم، ناانصافی اور نارواداری جیسی برائیوں سے شدید نفرت تھی۔ معاشرے میں موجود ناانصافیوں پر اس کے دل ودماغ میں جو غصہ پیدا ہوتا تھا وہ اپنی ذہانت سے اُسے مزاح میں تبدیل کر دیتا تھا۔ وہ اسے آگ کو روشنی میں بدلنے کا کام قرار دیتا تھا۔ وہ مذاق میں کہا کرتا تھا ’’میرا پیشہ یہ ہے کہ جو بات ذہن میں آئے وہ کہہ ڈالوں‘‘ اور جو باتیں اس کے ذہن میں آئیں وہ ننانوے کتابوں پر مشتمل ہوئیں۔ اس نے اپنے خیالات اپنی نظموں ناولوں، کتابچوں اور مضامین کے علاوہ ان دس ہزار خطوط میں بھی بیان کیے جو اس نے یورپ کی مشہور شخصیات کو لکھے تھے۔ روس کی ملکہ کیتھرائنِ اعظم کو فکر رہتی تھی کہ والٹیئر اس کے خطوط کا جواب دینے سے بور نہ ہو جائے۔

ڈنمارک کے حکمران کو سچین ہفتم نے والٹیئر سے معافی مانگی تھی کہ وہ اس کی تجویز کردہ تمام اصلاحات کو یک دم نافذ نہ کر سکا۔ سویڈن کے شاہ گستافس سوم نے وعدہ کیا تھا کہ وہ والٹیئر کے بتائے ہوئے انسان دوستی کے معیار کے مطابق زندگی بسر کرنے کی کوشش کرے گا۔ مستقبل میں جرمنی کا حکمران فریڈرک اعظم اِن دنوں پروشیا کا ولی عہد تھا۔ اس نے والٹیئر کو پوٹسدام آنے کی دعوت دی۔ والٹیئر اس قدر طویل سفر اختیار کرنے پر آمادہ نہیں تھا چنانچہ فریڈرک خود ہی بھیس بدل کر والٹیئر کے پاؤں چھونے چلا آیا۔

والٹیئر کے دوستوں کو اس کا صحیح ٹھکانہ معلوم رکھنے میں بڑی دقت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ ظالم حکمران، تنگ نظر پادری، بداطوار اور الٹے سیدھے قوانین ہر وقت اس کے تعاقب میں ہوتے تھے۔ وہ ہر وقت یا تو ایک جگہ سے بھاگ کر کسی دوسری جگہ پناہ لئے ہوتا تھا یا وطن بدری کی فکر میں ہوتا تھا۔ والٹیئر کی ہر کتاب اربابِ اقتدار کے غیظ وغضب کو بھڑکاتی تھی اور بہت جلد مصنف کسی نئی مصیبت میں گرفتار ہو جاتا۔ اکثر محکمہ احتساب اس کی نئی کتاب کے تمام نسخے سر بازار نذر آتش کر دیتا تھا۔ لیکن اس ساری کاروائی کا واحد نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ سارا یورپ چوراہوں میں جلتی کتابوں کے ڈھیروں سے اٹھتے شعلوں کی روشنی میں پڑھ سکتا تھا کہ بے معنی تمغوں سے لدے پھندے فوجی حکام، نام نہاد معززین، پراسرار علوم اور مابعد الطبیعات کے دعویداروں، خاندانی بادشاہوں، اور دوسروں پر کفر کے فتوے جاری کرنے والوں کے بارے میں والٹیئر کی رائے کیا ہے۔

والٹیئر ایسے افراد پر خصوصی توجہ دیتا تھا جو سمجھتے تھے کہ دنیا میں جو کچھ ہے سب ٹھیک ہے اور دنیا کا نظام اسی طرح چلتا ہے کہ انسانوں کا ہجوم ان چند خاندانی لوگوں کے جوتے اٹھاتا رہے جنہیں خدا نے عزت بخشی ہے۔ والٹیئر کے الفاظ اور لب ولہجے میں بلا کی کاٹ تھی۔ وہ کسی بھی شخصیت کا بلند وبالا بت ایک ہی جملے میں فنا کر سکتا تھا۔

1749 میں ایملی شاملے کی موت کے بعد اپنے وطن سے اس کے سارے بندھن ٹوٹ گئے جہاں اسے اتنی کڑی سزائیں دی گئی تھیں۔ چنانچہ والٹیئر فریڈرکِ اعظم کی دعوت قبول کر کے پٹسڈام پہنچ گیا۔ نوجوانی میں یہ دونوں ایک دوسرے کے مداح رہے تھے لیکن دونوں ہی خودسر اور خود پسند تھے۔ والٹیئر کے قریب رہ کر فریڈرک کو محسوس ہوا کہ اس کا شہرہ آفاق مہمان درباری مسخرے کے منصب پر قناعت نہیں کر سکتا۔ والٹیئر ،فریڈرک اور پروشیا کے امیر زادوں کی فوجی ذہنیت کو سخت ناپسند کرتا تھا۔ پروشیا کا ہر درباری اپنے آپ کو مہذب ثابت کرنے کی جو کوشش کرتا تھا والٹیئر بڑے تحقیر آمیز انداز میں اس کا مذاق اڑاتا تھا۔ رفتہ رفتہ فریڈرک کی نظروں میں والٹیئر بری طرح کھٹکنے

لگا۔ بالآخر فریڈرک نے غصے کی ایک چنگھاڑ کے ساتھ یہ کانٹا نکال پھینکا۔

بڑھاپے میں ایک بار پھر والٹیئر بے یارومددگار کھڑا تھا۔ فریڈرک کے دباؤ پر یورپ کی تمام حکومتوں نے والٹیئر پر اپنے دروازے بند کر لئے تھے۔

آخر کار بزرگ فلسفی کو ننھی سی آزاد جمہوریہ جنیوا میں پناہ ملی۔ یہاں اس نے ایک مکان خریدا جو جلد ہی یورپ بھر کے بہترین دماغوں کا مرکز بن گیا۔ لوگ دور دور سے سفر کر کے جنیوا پہنچتے اور اسے اپنا منتظر پاتے۔ والٹیئر کا دبلا پتلا جسم زرق برق کوٹ میں ملبوس ہوتا۔ ایک معصوم مسکراہٹ اس کے جھریوں بھرے چہرے پر پھیلی رہتی۔ رات گئے تک یورپ کے بہترین مفکرین کی ان مجلسوں میں وہ اپنی شاندار گفتگو سے مہمانوں کی تواضع کرتا۔ لوگ تین دن قیام کے ارادے سے آتے اور تین تین ماہ ٹھہر جاتے۔

کئی غریب افراد سیاسی یا مذہبی انتقام کا شکار ہو کر اس کے پاس پناہ طلب کرتے تھے۔ اس نے ان کے لئے مکان تعمیر کرنے شروع کر دیے۔ دیکھتے دیکھتے اس کی اراضی پر پورا گاؤں بس گیا اور اسے ایک گرجا اور پھر بچوں کے لئے ایک مدرسہ بھی تعمیر کرانا پڑا۔ اس نے اپنے گاؤں کے باشندوں کو ان کی صلاحیتوں کے مطابق کام پر لگا دیا۔ یہ لوگ جوتے بنانے اور مویشی پالنے سے لے کر کپڑا بُننے تک ہر قسم کا کام کرتے تھے۔ ان پناہ گزینوں میں بہت سے سوئس گھڑی ساز بھی شامل تھے۔ والٹیئر بہت جلد گھڑیوں کے پھلتے پھولتے کاروبار کا مالک بن گیا۔ وہ اپنی گھڑیاں دوسروں کے مقابلے میں ایک تہائی کم قیمت پر فروخت کرتا تھا۔ ان گھڑیوں کے لئے اشتہارات بھی وہ خود ہی لکھتا تھا۔

ٹاؤلوس نامی قصبہ مذہبی جنونیوں کا گڑھ تھا۔ 1762 میں شہر کے مضافات میں ایک نوجوان شخص کی لاش پھانسی پر جھولتی ہوئی ملی۔ افواہ یہ تھی کہ مرنے والا پروٹسٹنٹ تھا اور وہ رومن کیتھولک عقیدہ قبول کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ مذہبی جنونیوں نے یہ رائے قائم کی کہ اس کے ناتواں اور شریف باپ ژاں کیلاس نے اپنے نوجوان بیٹے کو خود ہی پھانسی دی تھی۔ ضعیف ژاں کیلاس پر وحشیانہ مظالم توڑے گئے۔ اس کے باوجود جب اس سے اعتراف جرم نہ کروایا جا سکا تو اسے اعتراف جرم کے بغیر ہی پھانسی دے دی گئی۔ اندھے قانون کی تلوار خاندان کے باقی افراد پر بھی چمکنے لگی۔

جب والٹیئر کو اس معاملے کی خبر ہوئی تو وہ بھڑک اٹھا۔ اس نے پوری قوت کے ساتھ ان تعزیراتی قوانین کی بھیانک نوعیت کو بے نقاب کرنا شروع کیا جو سوائے انگلستان کے تقریباً تمام یورپی ممالک میں نافذ تھے۔ ان قوانین میں نہ تو جیوری کا کوئی تصور تھا اور نہ ملزم کو اپنی صفائی کے لئے کوئی وکیل دیا جاتا تھا۔ ملزم کی حمایت میں کوئی شہادت قبول نہیں کی جاتی تھی۔ الزام عائد کرنے والے خفیہ شہادت دیتے تھے اور جج خود کو استغاثہ تصور کرتے تھے۔ والٹیئر کو یہ بھی معلوم ہوا کہ بیشتر فوجداری قوانین تحریری صورت کی بجائے محض قانون دانوں کے حافظے میں محفوظ ہیں۔ یہ بدمعاش لوگ کسی کو سزا دینے کی خاطر جس ڈھنگ سے چاہتے قانون کی تشریح کر لیتے تھے۔ مالدار اور بااثر افراد کو فوجداری قوانین کی اس دہشت ناک صورت کا کوئی علم نہیں تھا۔ عام طور پر سمجھا جاتا تھا کہ چونکہ قانون کی گرفت میں آنے والے بیشتر افراد غریب ہوتے ہیں لہٰذا غریب لوگ قدرتی طور پر بدچلن ہوتے ہیں۔

والٹیئر اپنے اثر و رسوخ اور کثیر دولت کے ساتھ میدانِ عمل میں کود پڑا۔ اس لیے اس کی جانی پہچانی للکار میں بے خوف ضمیر کی گونج بھی تھی اور سچی انسان دوستی کی پکار بھی۔ یورپ کے کونے کونے میں مطلق العنان حکمران اور ان کے منافع خور کارندے سوکھے پتوں کی طرح کانپ رہے تھے۔ والٹیئر کے اپنے بیان کے مطابق تین سال تک اُس کے پاس مسکرانے تک کا وقت نہیں تھا۔ اس کی بے خواب راتیں قانون دانوں، اربابِ کلیسا، بادشاہوں اور صحافیوں کے نام زوردار یادداشتیں تحریر کرنے میں گزرتی تھیں۔ اس کا ایک ہی مطالبہ تھا کہ کیلاس کے مقدمے کی نئے سرے سماعت کی جائے۔ والٹیئر نے عوام میں بیداری کی روح پھونک دی تھی۔ بالآخر بادشاہ کو اس مطالبے کے آگے سر جھکانا پڑا۔ اس نے سارے معاملے پر نظر ثانی کی۔ مردہ اور زندہ لوگ بے گناہ قرار دیے گئے اور ٹاؤلوس کی عدالت کو شرمناک مقدمے کا تمام ریکارڈ حذف کرنا پڑا۔ غم و غصے سے بھرے ہوئے ایک ضعیف فلسفی نے فوجداری قانون کی اصلاح کا وہ کارنامہ ممکن کر دکھایا تھا جس پر حکومتوں اور قانون دانوں نے گذشتہ آٹھ سو سال سے توجہ نہیں دی تھی۔

مقدمہ کیا جیتنا تھا کہ اس کے گرد نا انصافیوں کے مارے لوگوں کے ہجوم لگ گئے۔ والٹیئر نے اُن سب کیسز کو ہتھیار بنالیا اور حکمرانوں کے منہ پر دے مارا۔ واضح رہے کہ پادری سب سے بڑے ظالم ہوا کرتے تھے۔ جس کو چاہتے چرچ کے قوانین کی مخالفت کا الزام لگاتے۔ انہیں ہر طرح کی اذیت دینے حتیٰ کہ پھانسی چڑھانے کا اختیار بھی حاصل تھا۔ والٹیئر نے اُن کے ظالمانہ اختیارات کو ننگا کر دیا۔

دسمبر 1777 میں وہ فرانس چلا گیا۔ وہ ملک جو اس کا اپنا تھا اور جس سے وہ اذیت ناک انداز میں نکال باہر کیا گیا تھا، آج اس کے استقبال میں دیوانہ ہو گیا تھا۔

83 برس کی عمر میں بستر مرگ پر والٹیئر نے جو آخری عبارت لکھوائی وہ اس کے زندگی بھر کے عقائد کا حتمی اعلان کہی جا سکتی ہے۔

والٹیئر نے مئی 1778 میں وفات پائی۔ جہنم میں جائیں پادری جنہوں نے اس کی تدفین سے انکار کر دیا اور اس کی لاش کی بے حرمتی کی ٹھان لی تھی۔ اس کے دوستوں نے خفیہ خفیہ اسے شہر ہی سے باہر نکال کر اس کی شایانِ شان تدفین کی۔ ہم تو بس اُس کا آخری فقرہ ہی نقل کریں گے کہ قارئین کے فائدے کی چیز ہوگی: ''میں خدا کی عظمت کا اقرار کرتے ہوئے اپنے دوستوں کی محبت دل میں لیے اپنے دشمنوں سے نفرت نہ کرتے ہوئے اور بے ہودہ توہمات کو ناپسند کرتے ہوئے مر رہا ہوں''۔

والٹیئر کا فریضہ زندگی کے ساتھ ہی ختم ہوا۔ اب لوگوں کی باری تھی۔ جنہوں نے چند ہی برس بعد والٹیئر کی آواز پر لبیک کہا اور اُس کے اس نعرے کے ساتھ در و دیوار ہلا ڈالے: ''لوگو بیدار ہو جاؤ اور اپنی زنجیریں توڑ ڈالو''۔ چار سال کے اندر اندر اس کی میت پورے احترام کے ساتھ واپس پیرس لائی گئی اور اُس قید خانے کے کھنڈرات پر رکھ دی گئی جو ظلم و جبر کی سب سے بڑی علامت تھی۔

کیا آپ کو پتہ ہے کہ اُس رات کتنے لوگوں نے اسے دفن کیا تھا؟ ڈھائی لاکھ نے۔

میں نے ایک جگہ پڑھا کہ ''والٹیئر کو اُس قبرستان میں دفن کیا گیا جہاں فرانس کی عظیم ترین شخصیات ابدی نیند سو رہی ہیں۔۔۔''۔ پتہ نہیں والٹیئر جیسی اور کونسی ''عظیم ترین'' شخصیات تھیں وہاں پر!!۔

مزدکی تحریک

مزدک ساسانی بادشاہ، کباداول کے زمانے میں ایک زبردست آدمی تھا۔ وہاں زرتشتی مذہب رائج تھا۔ مزدک ایک زرتشتی مذہبی پیشوا تھا مگر اُسے عوام الناس کی بے پناہ غربت نے جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ بادشاہوں اور ملاّؤں کے جبری ٹیکسوں نذرانوں نے آبادی کو برباد کر کے رکھ دیا تھا۔

مزدک نے اس حرص اور ظلم سے نجات کے لیے ''جائیداد'' کے خاتمے کو اولین اور اہم ترین قدم قرار دیا۔ اس نے بڑے پیمانے پر سماجی بہبود کے پروگرام شروع کر دیے۔ اسے معلوم تاریخ میں اولین سوشلسٹ ہونے کی شہرت حاصل ہے۔

زرتشتیوں کے مطابق دنیا کا وجود اور اس کی بقا زراعت سے ہے۔

زرتشتی ملا (موبد) اپنے مذہبی احکامات کے برعکس اپنی متعدد حویلیوں کے گوداموں کو اناج سے بھرے رکھتے تھے اور ریشم و کم خواب کے لباس بنواتے تھے۔ ان کی شامیں اور راتیں اشرافیہ (وزرگان) اور امراء کے محلات میں گزرتی تھیں جہاں اُن کے زرق برق چغے امراء کے بیش قیمت لبادوں سے کچھ کم نہ ہوتے تھے۔

موبد اور وزرگان بہت بااثر اور طاقتور طبقات تھے۔ یہ ملا بادشاہ بناتے گراتے تھے۔ اوستا (مذہبی کتاب) کے چوکیدار اور آتش کدہ کے ٹھیکیدار موبد نے اس بدترین طبقاتی نظام کو عوام الناس کے سامنے یزدان (خدا) کا حکم بتلا رکھا تھا۔

ہم اُس زمانے کی بات کر رہے ہیں کہ جب طبقاتی ڈھانچے میں بادشاہ کباد ولد فیروز سب سے اوپر متمکن تھا۔ اس کا ایک بیٹا کاوس تھا، دوسرا بیٹا خسرو، تیسرا جام۔ کاؤس سب سے بڑا تھا لیکن وہ مزدکی تھا۔ اس لیے اسے ولی عہد نہیں بنایا گیا۔

جام ایک آنکھ سے کانا تھا۔ جو ولی عہد نہیں بن سکتا تھا۔ خسرو (انوشیروان) تیسرے نمبر پر تھا۔ جو مزدکیت کا دشمن تھا۔ اس لیے درباری اشرافیہ اور موبد اُسے ولی عہد بنانے پر متفق ہوئے۔

اِس حکمرانی میں اُن کے بعد سب سے بڑے مذہبی راہنما موبد موبدان (ملاّؤں کا ملاّ) کا نمبر آتا تھا، پھر ملاّ یعنی موبدان تھے۔ یہ وہ روحانی پیشوا تھے جو آتش کدوں کے نگہبان اور زرتشتی

مذہب کے رکھوالے تھے۔اسی طرح حاکمیت میں خودغرض اشرافیہ طبقہ (وزرگان) شامل تھا جو کہ حکمران طبقات میں شمار ہوتا تھا۔

ان سب سرداروں، اور ملاؤں کو پالنے والے کسان (دہقانان) تھے۔اِن دہقانوں کو ایک لحاظ سے غلام کی حد تک پست رکھا گیا تھا۔وہی جنھیں آج کل ''کھیت مزدور'' کہتے ہیں۔وہ اُن زمینوں پہ کام کرتے تھے، جو مالکان کی طرف سے اُن میں تقسیم کی جاتی تھیں۔یہ لوگ مالکان کو زمین کا مالیہ (خراگ، یعنی خراج) ادا کرتے تھے۔(1)

عام آدمی کا بچہ پڑھنے کے لیے سکول نہیں جا سکتا تھا، نہ دھوبی اور کسان اپنا آبائی پیشہ تبدیل کر سکتے تھے۔یعنی جاگیردار کو جاگیردار رہنا تھا اور کسان کو کسان ہی رہنا تھا، نسل در نسل۔بھلا اتنا منظّم مذہب بعد میں کسی نے دیکھا؟۔

وہاں ہر کوچے میں کوئی نہ کوئی آتش کدہ بنالیا گیا تھا۔یہ آتش کدے موبدوں اور ان کے چیلے چانٹوں کے روزگار کا ایک ذریعہ تھے۔یہ موبد، اور اس کے مددگار و معاون غریبوں سے ہر رسم کے لیے جبری چڑھاوے طلب کرتے تھے۔وہاں اُس آتش کدے میں، اُن کا دھیان آتش مقدس کی طرف نہیں، بلکہ آنے والوں سے نذرانے وصول کرنے کی طرف لگا رہتا تھا۔اُس وقت ذہن میں یہ سوال آتا تھا کہ اس قدر آتش کدوں کی کیا ضرورت ہے!۔عبادت گاہیں جتنی زیادہ ہوں گی دھرم کی قدر و قیمت اُسی قدر کم ہوتی جائے گی۔ملاّ جس قدر زیادہ ہوں گے اُن کی عزت و توقیر اسی نسبت سے کم ہوتی جائے گی۔ڈیمانڈ اور سپلائی کا سادہ اصول!!۔مگر وہ اس کا حل یہ نکالتے رہے کہ اسی نسبت سے خوف زدہ کرنے والی چیزوں اور بلاؤں کی تعداد میں اضافہ کرتے جاتے تھے۔یوں وہ آتش کدوں کے ماننے والوں کی تعداد بھی بڑھاتے جاتے تھے اور ورد اور عبادتوں میں بھی اضافہ کرتے جاتے تھے۔

عجیب اتفاق تھا کہ قرض دینے اور اُس پر منافع لینے کا رواج آتش کدوں سے شروع ہوا تھا۔موبدان کے پاس وزرگان کے گراں قدر نذرانوں اور غریب غربا کے چھوٹے موٹے چڑھاووں سے اتنی دولت جمع ہوگئی تھی، اور اتنا مال واسباب اکٹھا ہوا تھا کہ انہوں نے اول اول تجارتی قافلوں کو دوسرے شہروں اور مملکتوں میں فروخت کرنے کے لیے اناج قرض دینا شروع کیا تھا۔وہ منافع کا ایک حصہ خود لینے لگے۔پھر چھوٹے دکانداروں اور مزدوروں کو اناج یا سکوں کے قرضے دینے کا آغاز ہوا۔اس میں مقروض کا نفع نہ ہوتا تھا لیکن اضافی مال اُن سے لینا ضروری تھا۔(2)

اشرافیہ طبقہ دولت بھی بے حساب رکھتا تھا اور اُن کے پاس عورتیں بھی بے شمار تھیں۔امیر لوگ کھانے پینے کی اشیا بڑے پیمانے پر ذخیرہ کرتے تھے۔اِس حد تک کہ مصنوعی قحط پڑ جاتا تھا۔

اہل کار دندناتے ہوئے رعایا کے گھروں میں گھس کر تلاشیاں لیتے۔غریب غربا اور کمزوروں کی بہو بیٹیاں گھسیٹ کر اپنے آقاؤں تک پہنچا دیتے۔امرا کی عیاشیاں زوروں پہ تھیں۔

اس سارے خوف ناک پس منظر میں شاہ پور اول کے دور میں ایک نیا مذہبی رہنما مانؔی نمودار ہوا (3)۔اس نے ایرانی مذہب زرتشتی اور مسیحیت، اور صابی اور بدھ مت کی نمایاں خصوصیت سے ایک مرکب تیار کیا۔اس نے مذہبی آیتوں اور عبادات کا ایک سلسلہ لکھا۔وہ خاموشی سے اپنے مذہب کا پرچار کرتا رہا۔جب ساسانی بادشاہ شاہ پور (سال 243) بھی اس نئے مذہب میں شامل ہوگیا تو گویا یہ ریاستی سرکاری مذہب بن گیا۔تب وہ آزادانہ طور پر اپنے مذہب کا پرچار کرنے لگا۔

اس کے نام کی نسبت سے چلنے والی تحریک اور عقیدے کا نام ''مانویت'' پڑا۔ مانویت نے اُس سماجی ڈھانچے کو غیر منصفانہ قرار دیا اور اس پر زبردست تنقید کی۔یہ تحریک آگ کی طرح بہت کم عرصے میں دور دور تک پھیل گئی۔یہ فارس کی سرحدوں سے باہر ہند، یورپ اور وسطی ایشیا تک پھیل گئی۔ایک ایسی تحریک جس سے ہمارے اِس خطے کے غلام داری سماج میں زبردست ہلچل مچ گئی۔ایسے میں جب دوسرے علاقے بھی مفتوحات میں شامل ہوتے رہے تو اس غلام دارانہ سماج کے بالائی طبقے کو تو زبردست دولت ملی مگر ساتھ ساتھ سماج کے اندر بڑھتے ہوئے بحران میں بھی شدت پیدا ہوتی گئی۔کئی بغاوتیں ہوئیں مگر کوئی بڑی کامیابی نہ مل سکی۔

یہ مذہب ہمارے خطے میں دیر تک برقرار رہا۔کھلے مذہب کے بطور، بغیر کسی پکڑ دھکڑ کے، بغیر پابندی کے۔

مگر طبقاتی سماج اس قدر مضبوطی سے بالا دست طبقے کی مٹھی میں تھا کہ مانی زیادہ عرصہ زندہ نہ رہ سکا۔ ملاؤں کی نظر میں اس کا فرقہ ہمیشہ نفرت کی زد میں رہا اور اسے کافری سمجھا گیا۔ نہ صرف زرتشتیوں کے ملاؤں کی طرف سے بلکہ یہودی، مسیحی ملاؤں کی طرف سے بھی۔ بالآخر وہ ان کے ہاتھوں قید ہوا، اور بھاری زنجیروں کی اذیتیں سہتے سہتے 277 عیسوی میں قتل ہوا۔ اس کی تعلیمات کی کوئی تحریری صورت گری نہ ہوسکی۔ اس کے بعد اُس کے پیروکار روپوش ہوگئے۔ کچھ لوگ وطن چھوڑ گئے۔ مانی کے پیروکار اس قدر دہشت زدہ ہوئے کہ خفیہ خفیہ سینوں میں تعلیمات دبائے صرف اس قابل ہی تھے کہ اپنی اولاد تک انہیں منتقل کر پائیں۔

مانی کی موت سے تین صدیاں بعد بھی یہ فکر انڈر گراؤنڈ تھی۔ ہر پیروکار اپنے دوسرے ہم عقیدہ لوگوں کی طرح خفیہ خفیہ مانی کے دین کی تبلیغ کرتا تھا۔ اپنے قریبی اور خون کے رشتے کے لوگوں پر۔ مانی کے ایک پیروکار بام داد نے اپنے بیٹے مزدک کو مانی کی تعلیمات بتائیں۔ مزدک جو کہ موبد (آتش پرستوں کا ملاّ) تھا۔

شاہی دربار تو دنیا بھر میں ایک جیسے ہوتے ہیں۔ باہر کو نکلی غلیظ توندوں اور ابلیسی دلوں دماغوں والی اشرافیہ کی مجلس۔ یہاں کباد کے دربار میں کُرسیوں پر تشریف فرما محنت سے ناآشنا امرا، شہزادوں اور پنڈتوں کے گودام، سڑ جانے اور خراب ہوجانے کے لئے غلے سے بھرے پڑے تھے۔ اور باہر شدید ترین قحط سالی میں قرض میں ڈوبے عام انسان کی اموات ہورہی تھیں۔

..........موت، بھوک کی موت۔

زمینداروں' اشرافیہ' اور روحانی پیشوا اور مفلسوں کے درمیان طویل کش مکشوں کا سلسلہ جاری تھا جس سے ایک نئے عوامی انقلاب کی راہ ہموار ہورہی تھی۔ مزدک اِس صورتحال کو خوب دیکھ اور پرکھ رہا تھا۔ اُس نے مانی کی تعلیمات کے اطلاق کی راہیں ڈھونڈنی شروع کیں۔

البتہ، مزدک مانوی مذہب کے برخلاف البتہ یہ سمجھتا تھا کہ ترکِ دنیا کوئی ضروری جزو دین نہیں۔ اس نے نچلے طبقے کی اکثریت کی طرف اپنی توجہ مبذول کی۔ اس نے عورتوں کی نجات کا فارمولا مرتب کیا۔ بے جوڑ شادیوں کو مسترد کیا جس میں پیسے والا بوڑھا کھوسٹ نوعمر حسین لڑکیاں بیاہ لاتا۔(4)

فردوسی اپنے ''شاہنامہ'' میں بتاتا ہے کہ ''مزدک نے دربار میں کھڑے ہوکر بادشاہ سے سوال کیا کہ: ''اگر کسی کو سانپ کاٹ لے اور کسی آدمی کے پاس ''تریاق'' موجود ہو اور وہ دینے سے گریز کرے تو اُس کی سزا کیا ہونی چاہیے؟''۔ بادشاہ نے جواب دیا: ''خونی است آں مرد تریاق دار'' (تریاق رکھنے والا آدمی قاتل ہوگا)۔ مزدک نے دوسرا سوال پوچھا: ''اگر کوئی بھوکا ہو اور کسی دوسرے شخص کے پاس روٹی موجود ہو اور وہ نہ دے تو اُس کی سزا کیا ہونی چاہیے؟'' بادشاہ نے جواب دیا کہ ''خونی است ناکردہ، درگردنش'' (ایسے آدمی کی گردن پر خونِ ناحق متصور ہوگا)۔

مزدک نے وہیں بادشاہ کی باتوں کو اپنے حق میں استعمال کیا اور لوگوں سے کہا: ''جس جگہ بھی غلے کا ذخیرہ موجود ہو اُسے لوٹ لیا جائے۔(5)

......اور قیامت آگئی۔ کسانوں، مزدوروں اور کان کنوں کے غول امرا کے آراستہ وپیراستہ مہمان خانوں کا اسباب لوٹتے رہے۔

اس نے جائیداد کے لالچ اور عورت کی شہوت کو مردوں میں ساری برائی کے اسباب قرار دیا۔ اُس نے جائیداد کو مشترک قرار دے کر اِن ساری برائیوں کو دور کرنے کی خواہش کی۔

مزدک کسانوں سے یوں گویا ہوتا: ''میرے بھائیو! یہ دنیا، یہ زمین یہ پانی، خدائے بزرگ و برتر نے تخلیق کیے ہیں۔ یہ کسی ایک کی ملکیت کیسے ہوسکتے ہیں؟۔ ان پر گرمی سردی میں رات دن محنت تم کرتے ہو۔ بیج تم بوتے ہو۔ چنانچہ اناج اُگتا ہے۔ وہ تمہارا ہے۔ اناج اُس کا ہے جو محنت کرکے اسے اُگاتا ہے۔ یہ تم ہو جو محترم و قابلِ تعظیم، مستحقِ ثنا، اہورمزدا کے منصوبے کی تکمیل کرتے ہو کہ زمین ہری بھری رہے، اناج، پھل پھول پیدا کرے۔ یہ وزرگان اور دبیران اور امراء تو چور لٹیرے ہیں۔ تم اُن سے اپنا حق چھین کیوں نہیں لیتے؟''۔

مزدک یہ بھی کہتا ہے۔ ''امراء سے یہ کہنا، کہ وہ اپنے محلات، ہزاروں غلاموں، کنیزوں، بیویوں، لذیذ ترین غذاؤں، غلے سے بھرے گوداموں، گھوڑوں سے پُر اصطبلوں پر قناعت کریں، اور ایک مزدور سے یہ کہنا کہ وہ اپنے جسم کے چیتھڑوں پر، اپنے فاقوں پر قناعت کرے، کیا ایک ہی

مطلب رکھ سکتا ہے؟۔قناعت کے معنی یہ نہیں ہوسکتے۔اس کا اصل مطلب یہ ہی ممکن ہے کہ جب کہ سب کے پاس ان کی حقیقی ضروریات کے مطابق چیزیں موجود ہوں تب وہ ایک دوسرے کی چیزیں نہ چھینیں، ہوس کا شکار نہ بنیں۔یہ اصل قناعت ہے۔(6)

مزدک کا کہنا تھا کہ خدا نے بنیادی طور پر زمین پہ گزارہ کے ذرائع دے دیے تاکہ لوگ انھیں آپس میں مساوی طور پر تقسیم کریں۔مگر زورآور نے کمزور پہ بالادستی حاصل کی اور اس کا حصہ چھین کر نابرابری پیدا کی۔اُس سے ''پانچ بلاؤں'' کو طاقت ملی جس سے انسان حق کی راہ سے گمراہ ہوا۔یہ پانچ بلائیں تھیں: حسد، غصہ، انتقام، ضرورت، اور لالچ۔ان برائیوں پر قابو پانے کے لیے انصاف کی بحالی ضروری تھی اور یہ ضروری تھا کہ ہر شخص اپنی زائد چیزیں اپنے دوسرے انسان بھائی کو بانٹے۔اس کے لیے ساری دولت کو مشترک بنانا ضروری تھا۔مزدک نے کہا مال و دولت عوام میں تقسیم ہونا چاہیے کیونکہ تمام انسان خدا نے پیدا کیے ہیں۔پھر انسان حاجت مند کیوں ہوں؟ تمام انسانوں کو چاہیے کہ وہ ایک دوسرے کی کمائی ہوئی دولت سے استفادہ کریں تاکہ تنگدستی باقی نہ رہے اور تمام انسان مساوی الحال ہوجائیں۔مزدک کے عقیدے کے مطابق دنیا میں جتنا دکھ ہے وہ اسی نابرابری کی وجہ سے ہے۔اس کے لیے لوگ آپس میں لڑتے ہیں، جھوٹ بولتے ہیں، چوری کرتے ہیں، اور ایک دوسرے کا خون بہاتے ہیں۔یہی عدم مساوات معاشرے میں دُشمنی، رشک وحسد اور جنگ پیدا کرنے کا سبب ہے۔یہی وہ بلائیں ہیں جنہوں نے انسانی زندگی کو تباہ کر کے رکھ دیا ہے۔
اگر عدم مساوات دُنیا سے ختم ہوجائے تو یہ مصائب خود بخود نابود ہوجاتے ہیں اور ان کے بجائے صلح و صفائی، مہر و محبت، رفاقت اور انصاف جنم لے سکتے ہیں۔

مزدک کی ہدایت تھی کہ قتل و خونریزی نہ کی جائے اور اپنے دشمنوں سے بھی نرمی برتی جائے۔(7)

وہ کہتا تھا کہ ''نابرابری مزید نابرابری کو پیدا کرتی ہے۔حرص کی تکمیل آسودگی نہیں دیتی، بلکہ یہ مزید حرص کا لامتناہی سلسلہ بن جاتی ہے۔یہ اہرمن کی رضا تھی، خدا کی نہیں جو محبت امن اور حسن ہے، جو نور ہے۔خدا نے کسی کو دوسروں کے مقابلے میں زیادہ حصہ لینے کا حق نہیں دیا............ یہ عین زرتشت کا فرمان تھا''۔

عوام الناس کی حالت اس قدر خستہ اور پست تھی کہ مزدک کا فلسفہ آناً فاناً مقبول ہوا۔قحط کے زمانے میں گندم کے حصول میں مزدوروں کے غول اس کے ساتھ ساتھ پھرنے لگے۔

وہ انقلاب تو چاہتا تھا، وہ دنیا کے ہر دکھ کی جڑ اس نابرابری میں دیکھتا تھا، مگر یہاں احتیاط کی ضرورت بھی حد سے زیادہ تھی۔وہ مانی کے خوفناک انجام سے واقف تھا۔اُسے امرا، اور موبدوں کی طاقت کا علم تھا۔

زرتشتی ملاّؤں اور وڈیروں کی طاقت بہت بڑھ چکی تھی اور بادشاہ اُن کے ہاتھوں یرغمال بن چکا تھا۔اُس کی بادشاہی میں ملاّ ایک مسلسل دخل در معقولات بن چکے تھے۔بادشاہ اُن سے عاجز آچکا تھا۔وہ اُن کی اس طاقت کو کمزور کرنا چاہتا تھا۔اس لئے وہ کسی ایسی قوت کے انتظار میں تھا جو عوام میں مقبولیت رکھتی ہو۔اب جب کہ مزدک ایک عوامی روحانی اور انقلابی کے طور پر مقبول ترین شخصیت بن چکا تھا اور اُس کا نظریہ اب عوام الناس کا نجات دہندہ نظریہ بن چکا تھا تو شاہ کباد اول، (488۔531) نے اس نئے نظریے کی حمایت کی اور مزدکیت میں شامل ہوگیا۔بادشاہ کی پشت پناہی میں مزدک نے سماجی معاشی اصلاح کے پروگرام جاری رکھے جن میں امن پسندی، اور غریبوں کی مدد کے لئے امدادی پروگرام شامل تھے۔مزدک نے مزدوروں کی مدد کے لیے سرکاری سٹور کھول دیے۔

مزدک کے اس بظاہر وفادار شاگرد اور حامی، بادشاہ کباد نے ایک فرمان جاری کیا جس میں اُس نے سارے پارس کے باشندوں کو مزدک کے عقیدے کو تسلیم کرنے کا حکم دیا، اور اُسی کے فرمودات کے مطابق زندگیاں گزارنے کا حکم دیا۔نچلے طبقات بالخصوص عورتوں میں یہ مذہب بہت مقبول ہوا۔

چنانچہ مزدکیوں نے سماجی برائیوں کے خلاف کھلے عام جدوجہد کرنے کا اعلان کیا۔ان کا مطالبہ تھا کہ فاضل جائیداد رئیسوں سے چھین لی جائے۔اب شاہی حکم موجود تھا۔چنانچہ وہ فوراً امیروں کی جائیدادوں پر قابض ہوئے۔(8)

ظاہر ہے کہ ان تمام اقدامات سے وڈیرے یعنی وزرگان اور زرتشتی پیشوا یعنی موبدان ، کباد بادشاہ کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ مگر کباد صورتحال کو غلط سمجھا تھا۔ موبد اور وزرگان کی قوت مزدک کی قوت سے بہت بڑی تھی۔ یوں ملاّ وڈیرہ اتحاد نے ردِ انقلاب میں (496 میں) شاہ کباد کا تختہ الٹ کر اُسے زنداں میں مقید کر دیا اور وقتی طور پر کباد کے بھائی گاماسپ کو تخت پر بٹھا دیا۔ کباد نظر بند ہوا۔ مگر اس کا بیٹا خسرو جو بعد میں انوشیرواں کہلایا اور اس کا اتالیق ''برز چہر'' مزدک کے سخت مخالف تھے۔ ان لوگوں کی مدد سے کباد زنداں سے فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا اور حیاطلہ کے بادشاہ '' خاقان'' خوشنواز کے یہاں پناہ لی۔ خوشنواز نے اپنی بیٹی سے کباد کی شادی کی اور فوجی معاونت کے طور پر ایک لشکرِ جرار کباد کے سُپرد کیا تاکہ وہ اپنے بھائی گاماسپ کو ایران کے تخت سے اُتار سکے۔

یوں کباد ہپتلائٹس کی مدد سے 498/499 میں جیل سے بھاگنے اور دوبارہ اقتدار سنبھالنے میں کامیاب ہوا۔(9)

اب تو کباد کی سمجھ میں اصل صورت حال آ گئی۔ اُسے اندازہ ہوا کہ موبدان بہت طاقتور ہیں۔ اُن کی مخالفت مول لے کر بادشاہی نہیں کی جاسکتی۔ اُس نے مزدک کی قوت کو بہت بڑھا چڑھا کر دیکھا تھا۔ اِسی لیے تو مذہب بدل دیا تھا۔ مگر اب جب اُسے طاقت کے اصل توازن کا اندازہ ہوا تو اس نے پھر پرانا مذہب اختیار کیا۔ مزدکیت بادشاہی کے وارے میں نہ تھی۔ حریت اور مساوات ہوں تو بادشاہی تو ختم ہو جاتی ہے۔ لہذا مساوات گئی بھاڑ میں، بادشاہت دوبارہ جی اٹھی۔

اس مرتبہ کباد کی سیاست بدل چکی۔ اُس نے مزدک اور مزدکیوں سے پہلے کی طرح سلوک روا نہیں رکھا بلکہ سرد مہری سے پیش آنے لگا۔ کباد کو یقین ہوگیا کہ مزدک اپنے انقلابی پیروکاروں کی وساطت سے ساسانی بادشاہت کا تختہ اُلٹنا چاہتا ہے۔ اب وہ سمجھ چکا تھا کہ مزدکیت ایک ایسا انقلاب ہے جس نے درمیان میں کہیں بھی رکنا نہیں ہے، اور جو اُس کی بادشاہت کے خاتمے پر جا کر دم لے گا۔ چنانچہ اس نے مزدک کو ایرانی شہنشاہیت کا زبردست دشمن قرار دیا۔ اب کے اس نے زندیقوں (مزدکیوں)ہی کا قتلِ عام شروع کیا۔ یہودی بھی اس مزدک مخالف جنگ میں پیش پیش تھے۔ بہانہ وہی عورتوں والا تقدس تھا۔ عورت اور غیرت تاریخ میں ''سٹیٹس کو'' کے سب سے بڑے ہتھیار رہے ہیں۔ یہ تو اچھا تھا کہ مزدک خود مذہبی پیشوا تھا ورنہ یہ قتل وغارت خدا کے نام پر کی جاتی۔ تصور کیا جاسکتا ہے کہ حتیٰ کہ ''بدھ'' کے نام پہ لاکھوں قتل ہو چکے ہیں۔ یہودی کے ہاں تو ویسے بھی عورتیں سماج کے لیے خطرہ ہیں اس لیے زنانہ خوش سلیقیت کی ساری نمائشیں دبا دی گئیں۔ لہٰذا یہودی اور موبد نے ایک بار پھر بھاری سودخوری کی ، معصوموں کو قتل کر دیا اور شیطانوں سے سمجھوتہ کیا۔(10) اس قتلِ عام کی قیادت کباد کے ولی عہد شہزادہ خسرو اول نے کی جسے پھر، انوشیروان (انوشک۔روبان''لافانی روح والا'') کا خطاب ملا۔

کباد، کل ملا کر 41 برس کی بادشاہت کرنے کے بعد مر گیا۔ انوشیروان بادشاہ بن گیا۔ مزدکیوں کی بدبختی آ گئی، بلوچوں کی بدبختی آ گئی۔

اس نے اِن طبقاتی مخالفین کا قتلِ عام شروع کر دیا۔ مزدکیوں کے قتلِ عام' کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ انوشیرواں کے حکم سے مزدکی فرقے کے چھوٹے بڑے افراد ایک ہی دن تہ تیغ کر دیے گئے۔

کہتے ہیں کہ انوشیروان نے اب اپنے ہی مخالف وڈیروں اور ملاؤں کی قیادت کرتے ہوئے جھوٹ موٹ میں مزدکیت کا مذہب قبول کر لیا۔ اس نے شام کے وقت ایک جشن منعقد کرنے کی تاریخ مقرر کر دی جس میں اس نے علی الاعلان طور پر باقاعدہ مزدکیت قبول کرنا تھی۔ اس نے شاہی باغ میں یہ جشن منعقد کرنے کا فیصلہ کیا اور اُس کے دعوت نامے مزدکیوں کو جاری کیے۔

مقررہ دن پر جب مزدکیوں کا ہر گروپ باغ میں داخل ہوتا تو پہلے سے چھپے ہوئے فوجی انہیں پکڑ لیتے' اور انہیں سر کے بل زمین پر اس طرح گاڑ دیتے کہ اُن کی ٹانگیں زمین کے اوپر ہوا میں ایک درخت کی طرح نظر آتیں۔

جب سب قتل کر دیئے گئے اور جب مزدک آ گیا تو پھر خون آشام انوشیروان نے مزدک کو باغ کا معائنہ کرنے کی دعوت دی:

''آپ وہاں ایسے درخت دیکھیں گے جو آج تک کسی نے نہیں دیکھے اور کسی نے اُن

کے بارے میں حتیٰ کہ قدیم داناؤں کے منہ سے بھی نہیں سنا۔(11)

اندر جا کر انوشیروان نے الٹی کھڑی کی ہوئی لاشوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے چیخ کر مزدک سے کہا: ''رک جاؤ! یہ ہے وہ فصل جو تم نے اپنے شیطانی نظریے سے کاشت کی تھی''۔

فوجیوں نے مزدک کو قابو کرلیا۔ باغ کے وسط میں اسی مقصد کے لئے خصوصی طور پر تیار کردہ بلند مقام پر اسے زمین میں زندہ گاڑ دیا گیا اور بے شمار تیروں سے اسے چھلنی کر دیا۔ یہ واقعہ 528 کے اواخر یا 529 کے اوائل میں پیش آیا۔(12)

فلاسفر اور مبارز مزدک کی موت کا منظر تاریخ کے منہ پر ایک دُھائی ہے۔ استبداد کی اس طرح کی کوئی مثال دنیا میں موجود نہیں ہے۔

انوشیروان اپنی بے پناہ جلالت وقوّت سے مزدکی بلوچ کاشتکاروں اور مویشی بانوں پر ٹوٹ پڑا۔

انوشیرواں نے مزدک اور اس کے ساتھیوں کو قتل تو کر دیا۔ مگر ظاہر ہے اتنے بڑے اور منصفانہ نظریے کو ختم تو نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ضیاء الحقی خصوصیات والے انوشیروان نے 531 میں مزدکیوں کے قتل عام کا ایک اور دور چلایا۔ اس نے ہر خاص و عام کو حکم دیا کہ کوہ و دشت میں ہر جگہ مزدکیوں کو گرفتار کریں۔ پھر، اُس نے اُن سب کو جمع کیا اور ایک صبح سب کو قتل کر دیا۔ کہتے ہیں کہ اس چنگیز کے ہاتھوں تیس ہزار مزدکی مارے گئے۔ (اندھے دانشوروں نے قاتل کو عادل بنا ڈالا)۔

اُس نے بہ ظاہر تو مزدک کی تعلیمات کو مکمل طور پر تباہ کر دیا مگر یہ فلسفہ تو مزدک کی شہادت سے بعد بھی کئی صدیوں تک جاری رہا۔ بلاشبہ مزدک کی تحریک ہمارے خطے کی تاریخ میں سب سے بڑی طبقاتی تحریک تھی۔(13)

مزدک کی انقلابی تحریک 494 عیسوی سے شروع ہوئی اور 524 عیسوی یعنی مکمل تیس سال تک بھرپور انداز میں جاری رہی۔(14) یہ غلام داری سماج میں ابھری۔

مزدکیت کا دورا اسلام آنے سے بہت پہلے کا دور تھا۔ غالب خیال ہے کہ اسلام سے قبل بلوچوں کی اکثریت اسی انقلابی مسلک ''مزدکیت'' سے وابستہ تھی۔ اور یہی بات دُشمنی اور نفرت کی اُس گہرائی اور شدت کا باعث تھی جو انوشیروان کو بلوچوں سے تھی۔ آپ تصور کریں کہ مندرجہ ذیل فرمان جاری کرنا عام نفرت تو نہ تھی: (شاہنامہ)

چاہے کوئی چھوٹا بچہ ہو
یا پھر تلوار اٹھانے والا پہلوان مرد
(وہ) بڑا ہجوم ہوں یا تھوڑے سے
ایک بھی نہ بچنا چاہیے

تفصیل میں جائے بغیر یہ بتانا کافی ہے کہ حکم کی تعمیل ہوگئی۔ اور رپورٹ یوں پیش کی گئی:

از ایشاں فراوان واندک نماند
زن و مرد جنگی و کودک نما ند
سراسر بہ شمشیر بگذاشتند
ستم کردن و رنج برداشتند
بو دایمن ازرنج شاہِ جہان
بلوچے نماند آشکارو نہان

ترجمہ:

ان میں سے ہجوم اور اکا دکا کوئی باقی نہ بچا
عورتیں اور جنگ کے قابل مرد اور بچے باقی نہ بچے
سب کے سب کو تلوار کے حوالے کیا گیا
جہان کے شاہ کو رنج سے نجات ہوئی
ایک بھی بلوچ ظاہر یا خفیہ، باقی نہ بچا

نفرت و دشمنی کی اور بھی چھوٹی موٹی وجوہات ہوں گی مگر اس قدر اتھاہ نفرت تو طبقاتی نفرت ہی ہوا کرتی ہے۔ ایک قوم نچلا طبقہ بن چکی تھی اور بادشاہی نظام سے ٹکرا گئی تھی۔

مزدك Vol-1

ریفرنسز

1۔امروہوی،خیال۔مزدک۔کلاسیک دی مال۔لاہور۔صفحہ 41
2۔فہمیدہ ریاض۔قلعہ فراموشی۔دنیازادکراچی ۔36۔صفحہ 153
3-آ کسوردی...........صفحہ 52۔
4۔طلوع اسلام۔نومبر 1954،صفحہ 42
5۔امروہوی،خیال۔مزدک۔کلاسیک دی مال۔لاہور۔صفحہ 16
6۔فہمیدہ ریاض۔قلعہ فراموشی۔دنیازادکراچی ۔36۔صفحہ 129
7۔امروہوی،خیال۔مزدک۔کلاسیک دی مال۔لاہور۔صفحہ 55
8۔ہنرخ گریٹز۔ہسٹری آف دی جیوز۔جلد 3،1956 ۔ The Jewish Publication society of America۔صفحہ 1
9-آ کس وردی۔صفحہ 625
10-ہنرخ گریٹز۔ہسٹری آف دی جیوز۔جلد 3،1956 ۔ The Jewish Publication society of America۔صفحہ 2
11-آ کس وردی۔صفحہ 63۔
12۔امروہوی،خیال۔مزدک۔کلاسیک دی مال۔لاہور۔صفحہ 19
13-براؤن،صفحہ 171۔
14۔امروہوی،خیال۔مزدک۔کلاسیک دی مال۔لاہور۔صفحہ 37